الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

انسان کی سب سے اعلیٰ صفت بہادری ہے
اور اس کی سب سے بری صفت کمینہ پن

دسمبر ۱۹۸۶ شمارہ ۱۲۱

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۱ دسمبر ۱۹۸۶

فہرست

	صفحہ		صفحہ
ناشکری نہیں	۲	ہم کو فائدہ ہے	۲۴
جوشِ عمل	۳	ایک تقریر	۲۶
کتنا مشکل کتنا آسان	۴	اسلام پسندوں کے مسائل	۲۸
خدا، رسالت، آخرت	۵	سرکشی	۳۰
دو قسم کے انسان	۸	ایک سفر	۳۱
دلیل یا دھاندلی	۱۰	اخلاقی قیادت	۴۲
اسلام کی آفاقیت	۱۱	انسانی صفات	۴۳
والدین کی ذمہ داری	۱۶	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۴
آزمودہ حل	۱۷	تعمیرِ ملت	۴۷
خط مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا	۲۱	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ناشکری نہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
(دنیا کے معاملہ میں) اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے، اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے۔ اس طرح تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو گے :

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : « أنظروا إلى من هو أسفل منكم و لا تنظروا إلى من هو فوقكم ، فإنه أجدر أن لا تزدروا نعمة الله عليكم » (رواه الترمذی)

دنیا کی چیزوں کی تقسیم میں یکسانیت نہیں۔ یہاں کسی کو کم ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو ایک چیز دی گئی ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ اس صورت حال نے دنیوی معاملات میں ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان فرق کر دیا ہے۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس کو اپنے سے کم نظر آتا ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرنے لگے جو بظاہر اس کو اپنے سے زیادہ دکھائی دیتا ہے تو اس کے اندر ناشکری کا احساس ابھرے گا۔

اس نفسیاتی خرابی سے بچنے کا آسان حل یہ بتایا گیا ہے کہ ہر آدمی اس کو دیکھے جو اس کے نیچے ہے، وہ اس کو نہ دیکھے جو اس کے اوپر ہے۔

شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے کچھ لوگوں کو جوتا پہنے ہوئے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو، خدا نے ان کو جوتا دیا اور مجھے بغیر جوتے کے رکھا۔ وہ اسی خیال میں تھے کہ ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس سے بہتر بنایا اور ان کو دو تندرست پاؤں عطا کیے ——— اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندہ سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس کا شکر گزار بنے۔ مگر موجودہ دنیا میں شکر گزار وہی شخص رہ سکتا ہے جو اس اعتبار سے اپنا نگراں بن گیا ہو۔

جوشِ عمل

دورِ اول کے مسلمانوں میں اسلام کے لیے جو جوشِ عمل تھا، وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دورِ اول کے مسلمانوں کے لیے اسلام ایک دریافت تھا، اسلام کی صورت میں انھوں نے ایک نئی حقیقت پائی تھی۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے اسلام محض ایک تقلیدی عقیدہ ہے۔ وہ انھیں وراثتی طور پر مل گیا ہے، نہ کہ اس کو انھوں نے ایک نئی اور برتر حقیقت کے طور پر دریافت کیا ہے۔

ایک نئی چیز کا پانا آدمی کے لیے سب سے زیادہ اہم واقعہ ہوتا ہے۔ وہ آدمی کی فکر و عمل کی صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ جو آدمی اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز نہ پائے، اس کی مثال سوئے ہوئے آدمی کی سی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز پا جائے وہ گویا وہ آدمی ہے جو نیند سے جاگ اٹھا۔ وہ بے حرکت کی حالت سے حرکت کی حالت میں آ گیا۔

موجودہ زمانہ میں نفسیات کے میدان میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ ان تحقیقات میں سے ایک تحقیق اس موضوع پر تھی کہ وہ کیا چیز ہے جو کسی آدمی کو عام لوگوں سے زیادہ عمل کرنے پر اکساتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں اس موضوع کی تفصیلات دیتے ہوئے بتایا گیا ہے:

psychological experiments in the fields of motivation and learning have disclosed in the power of novelty as an inducement to action.
(III/227)

حرکت اور علم کے میدان میں نفسیاتی تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ نیا پن اپنے اندر عمل پر ابھارنے کی طاقت رکھتا ہے ——— موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں زندہ ایمان پیدا کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے۔ یہ کہ ان کے ایمان کو دوبارہ ان کے لیے دریافت کے ہم معنی بنا دیا جائے۔

کتنا مشکل کتنا آسان

ایک صاحب ملے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی ایک بڑی ڈگری ہے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ "مولانا صاحب، آپ انگریزی رسالہ نکالتے ہیں۔ مگر آپ کے رسالہ کی انگریزی غلط ہوتی ہے۔" میں نے کہا کہ آپ زبان کی غلطی کی کوئی مثال دیجئے۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۶ تھا۔ اس شمارہ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ایک مضمون انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ (یہ مضمون الرسالہ اردو اور انگریزی دونوں میں موجود ہے) یہ انگریزی مضمون حسب ذیل ہے:

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul. That being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a gift of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

مذکورہ بزرگ نے اس عبارت کی چوتھی سطر میں لفظ sent پر نشان لگاتے ہوئے کہا کہ دیکھیے یہ غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ "یہاں if you send ہونا چاہیے نہ کہ if you sent جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔" مگر جو لوگ انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اعتراض درست نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ معاف کیجئے، آپ نے یہ بات محض جوشِ اعتراض میں فرمائی ہے نہ کہ بربنائے واقفیت آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اس اعتراض کی تحقیق کے لیے گرامر کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز ایسا نہ فرماتے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پرنسپل کلاز میں چوں کہ لفظ would (سکنڈ فارم) استعمال ہوا ہے، اس بنا پر سب آرڈینیٹ کلاز میں بھی sent (سکنڈ فارم) استعمال کیا جائے گا۔ یہی انگریزی گرامر کا اصول ہے:

The form 'sent' is gramatically necessitated by the use of the word 'would' in the principal clause of the sentence. The other possible alternative would be 'could send' but not 'send.'

میرے اس جواب کے بعد مذکورہ بزرگ چپ ہو گیے۔ تاہم انھوں نے زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ تم غلطی پر ہو کہنا کتنا زیادہ آسان ہے اور میں غلطی پر ہوں کہنا کتنا زیادہ مشکل۔

خدا، رسالت، آخرت

موجودہ دنیا مادی دنیا ہے۔ مگر یہاں مادی واقعات کی صورت میں معنوی حقیقتوں کی تمثیلات قائم کردی گئی ہیں۔ آدمی اگر سنجیدہ ہو اور وہ چیزوں کو غور و فکر کے ساتھ دیکھے تو وہ یہاں ہر قسم کے اطمینان بخش دلائل پالے گا۔ وہ معتقدات کے حق میں یقینیات کی زمین حاصل کرلے گا۔

خدا کی تمثیل

خدا کی تمثیل خود انسان کا اپنا وجود ہے۔ انسان کا وجود خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ "خدا" کیا ہے۔ ایک زندہ ہستی جو خود اپنی ذات میں قائم ہو۔ جو سوچے۔ جو دیکھے اور سنے۔ جو اپنے ارادہ کے تحت عمل کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ جو خود اپنے آپ کو جانتا ہو اور دوسروں سے بخوبی طور پر واقف ہو۔ جو تمام موجودات سے الگ اپنی ایک "انا" رکھتا ہو۔

یہ سب کچھ عین وہی ہے جس کو "انسان" کی صورت میں ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے۔ ہر آدمی "میں" سے بخوبی طور پر واقف ہے۔ خدا پر ایمان اسی "میں" کی ایک برتر صورت پر یقین رکھنا ہے۔ انسان جن صفات اور خصوصیات کے ساتھ اپنی ذات کا تجربہ کر رہا ہے، انھیں صفات اور خصوصیات والی ایک اور برتر ذات ہے جس کو ہم خدا یا اللہ کہتے ہیں۔

اگر میرا وجود یقینی ہے تو خدا کا وجود کیوں یقینی نہیں۔ اگر میں ایک مقام پر بیٹھ کر کائنات کو دیکھ رہا ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے اگر اسی طرح ایک عظیم تر ہستی کہیں متمکن ہو کر کائنات کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ اگر میں ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعہ خلا میں ایک مشین کو چلاتا ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے اگر اسی طرح ایک خدا اپنے نظام کے تحت کائنات کو چلا رہا ہو۔ اگر میں اپنے تصور عدل کے مطابق کسی کو سزا یا انعام دیتا ہوں تو اس میں استبعاد کیا ہے اگر اسی طرح ایک طاقتور خدا تمام انسانوں پر اپنے تصور عدل کے مطابق سزا اور جزا کا نفاذ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان کے وجود کو تسلیم کرنا۔ خدا کو ماننا بلاشبہ عجیب ہے۔ مگر انسان کو ماننا بھی اتنا ہی عجیب ہے۔ پھر ایک عجیب کو مان لینے کے بعد دوسرے عجیب کو ماننے میں کیا رکاوٹ۔

پیغمبر کی تمثیل

"ہم لندن سے بول رہے ہیں، اب آپ آج کی تازہ خبریں سنیے" یہ الفاظ ایک شخص ہم سے دور لندن میں بیٹھ کر بولتا ہے۔ ہم اس کو براہِ راست نہیں سن پاتے۔ لیکن جب ہم اپنا ریڈیو سٹ چلاتے ہیں تو ہم فوراً اس آواز کو سننے لگتے ہیں۔

دور کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہماری قابل فہم زبان میں ہمارے لیے پروگرام نشر کرتا ہے، ہم اس کو براہِ راست اپنے کان سے نہیں سن پاتے۔ لیکن جب ہم ریڈیو سٹ کا سہارا لیتے ہیں تو ہزاروں میل دور سے نشر ہونے والا پروگرام ہم کو اس طرح سنائی دینے لگتا ہے جیسے کہ ہمارے اور نشر گاہ کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو گیا ہو اور ہم براہِ راست اس کو سننے لگے ہوں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ بلا تشبیہہ پیغمبر کا بھی ہے۔ پیغمبر گویا ہمارے لیے ایک قسم کا ریڈیو سٹ ہے۔ وہ ہمارے اور خدائی نشر گاہ کے درمیان یقینی واسطہ کا کام کرتا ہے۔ جس طرح عام ریڈیو یا ٹرانسمٹر یہ کرتا ہے کہ نشر گاہ کی خبریں اور پروگرام وصول کر کے دوبارہ ہمیں سناتا ہے۔ اسی طرح خدا پیغمبر کو یہ طاقت دے دیتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آنے والی آوازوں کو اخذ کر سکے۔ پیغمبر خدا کی خصوصی توفیق سے ان کو نہایت صحت کے ساتھ اخذ کرتا ہے اور پھر کسی حذف و اضافہ کے بغیر ان کو ہمیں سنا دیتا ہے۔

پیغمبر انسان اور خدا کے درمیان ایک زندہ ریڈیو سٹ ہے۔ اگر پیغمبر نہ ہو تو ہم خدا کی آوازوں کو نہ سن سکیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے مشینی ریڈیو سٹ کے بغیر کوئی شخص دور کی نشر گاہوں سے نشر ہونے والے پروگرام کو نہیں سن پاتا۔ لوگ دنیوی نشر گاہوں کی نشریات کو سننا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ریڈیو اور ٹرانسمٹر کو بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ آج ساری دنیا میں کوئی بھی گھر اس سے خالی نہیں۔ اسی طرح اگر آدمی کو خدائی نشریات کی اہمیت معلوم ہو جائے تو وہ پیغمبر کو دل و جان سے چاہنے لگے۔ وہ ان باتوں کو انتہائی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سنے جو پیغمبر نے بتائی ہیں۔

پیغمبر کے معاملہ کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ریڈیو کے معاملہ کو سمجھنا۔ پیغمبر اسی قسم کے ایک کام کو الہامی طور پر کر رہا ہے جس کو عام ریڈیو سٹ مشینی طور پر انجام دیتا ہے۔

عالمِ آخرت کی تمثیل

ایک کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ بول رہے ہیں اور سن رہے ہیں۔ وہ اپنے سامنے

ایک پوری دنیا کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ وہی دنیا ہے جو محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ بظاہر محسوس دنیا کے سوا کوئی اور دنیا نہیں جو وہاں اپنا وجود رکھتی ہو۔

اتنے میں ایک شخص سامنے رکھے ہوئے ٹیلی وژن سٹ کو چلا دیتا ہے۔ اچانک اس کے شیشہ پر ایک اور دنیا دکھائی دینے لگتی ہے جو ابھی تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چلتے پھرتے انسان ان کی آوازیں، ان کے مکانات، ان کی کارگزاری سب آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

آخرت کا نظریہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیا کے پرے ایک اور دنیا ہے۔ یہ دوسری دنیا اسی طرح ایک مکمل دنیا ہے جس طرح ہماری موجودہ نظر آنے والی دنیا۔ ٹیلی وژن گویا اس نظریہ کی عملی تصدیق ہے۔ ٹیلی وژن کا تجربہ بتاتا ہے کہ کس طرح موجودہ محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا موجود ہو سکتی ہے۔ ٹیلی وژن کی دنیا ہمارے گرد و پیش پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ صرف اس وقت ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے جب کہ ٹیلی وژن سٹ کو چلا جائے۔ اسی طرح آخرت کی دنیا پوری طرح یہاں موجود ہے۔ البتہ وہ ہمارے مشاہدہ میں اس وقت آئے گی جب کہ خدا اس کے ظہور کا حکم دیدے۔

سائنس میں اکثر کسی چیز کو "ماڈل" سے سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دنیا گویا ایک قسم کا مادی ماڈل ہے جس کے ذریعہ ہم غیر مادی حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری دنیا ایک اعتبار سے بالاتر حقیقتوں کا آئینہ ہے، آدمی اگر سنجیدہ طور پر سوچے تو وہ اس کے اندر اپنے تمام سوالات کا جواب پائے گا۔

خدا اور وحی اور آخرت غیب کی چیزیں ہیں۔ انسان اپنی موجودہ نگاہ سے ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر دنیا میں بہت سی چیزیں، بلکہ تمام اعلیٰ حقیقتیں وہ ہیں جو آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ آدمی قرائن کی بنیاد پر ان کو مانتا ہے۔ یہی معاملہ خدا اور وحی اور آخرت کا بھی ہے۔ یہ چیزیں بلاشبہ موجودہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ چیزیں حقیقی ہیں اور یقینی طور پر وہ اپنا وجود رکھتی ہیں۔

آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو وہ ان کو مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دو قسم کے انسان

والتین والزیتون - وطور سینین - وھذا البلد الامین - لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم - ثم رددناہ اسفل سافلین - الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون - فما یکذبک بعد بالدین - الیس اللّٰہ باحکم الحاکمین - (التین)

قسم ہے تین اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو سب سے اچھی ساخت پر۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو سب سے نچلی پستی میں۔ مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں تو ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا۔ پھر کیا چیز تجھ کو روز جزا کے جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے۔ کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔

تین اور زیتون سے مراد فلسطین کی دو پہاڑیاں ہیں جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور بعثت ہوئی۔ طور، صحرائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا۔ بلد امین (مکہ) وہ شہر ہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے گیے۔ بائبل میں ہے: خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر چمکا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا (استثنا ۳۳ : ۱-۲) یہود کی نظر میں سب سے زیادہ عظمت حضرت موسیٰ کی تھی اور عیسائیوں کی نظر میں حضرت مسیح کی۔ اس لیے پیغمبر آخر الزماں کے ساتھ ان دونوں مسلّمہ شخصیتوں کی مثال دے کر بتایا کہ خدا کی طرف سے ان داعیوں کا آنا کس طرح ایک عظیم حقیقت کو آشکارا کرنے کا سبب بنا۔ وہ یہ کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک احسن تقویم کے مقام پر ہے اور دوسرا اسفل سافلین کے مقام پر۔ اور جب انسانوں میں اس قسم کا فرق پایا جائے تو ان کا انجام ایک کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر دنیا کی زندگی میں خدا کی عدالت ہے۔ وہ اسی لیے آتا ہے کہ دو قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے۔ ایک وہ انسان ہے جو حق کے آگے جھک جاتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو حق کے آگے سرکشی دکھاتا ہے۔ ایک دوزخ میں جی رہا ہے، دوسرا جنت میں سانس لے رہا ہے۔ پیغمبر اس لیے آتا ہے

کہ دونوں قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ دودھ بلویا جاتا ہے تو مکھن الگ ہو جاتا ہے اور چھاچھ الگ۔ اسی طرح پیغمبر کی دعوت کا اٹھنا ایک قسم کا بلونے کا عمل ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں قسم کے انسان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

کسی آبادی میں جب اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارنے کے لیے اٹھتا ہے تو عملاً یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور کچھ اس کے منکر بن جاتے ہیں۔ یہ گویا انسانیت کی تقسیم ہے جو اللہ کے نمائندے کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ وہ شخص جو اپنی فطرت کو زندہ کیے ہوئے تھا اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ سچائی کی آواز کو اس طرح پہچان لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کی آواز کو۔

خدا نے اس کو انسان کی زبان سے پکارا تو اس نے اپنے رب کی آواز کو پہچان لیا اور اس کی طرف دوڑ پڑا۔ حق کی دعوت جب اس کے ذہن سے ٹکرائی تو اس کے اندر اعتراف، تواضع، تقویٰ اور حق شناسی ابھرا۔ اس نے اپنی زندگی کو پوری طرح اللہ کے راستہ پر ڈال دیا۔ دنیوی مفاد، عزت کا سوال، مصلحتوں کے اندیشے، کوئی بھی چیز اس کے لیے اپنے رب کا راستہ اختیار کرنے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جنھوں نے خدا کی دی ہوئی آنکھ اور کان کو اس طرح بگاڑ رکھا تھا کہ خدا کی آواز انتہائی عیاں ہونے کے باوجود، ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وقتی مفادات، عوامی دباؤ اور شخصی مصالح کو انھوں نے وہ اہمیت دی جو صرف حق کو دی جانی چاہیے۔ انھوں نے دنیا کے تقاضوں کو ترجیح دی اور آخرت کے تقاضوں کو ٹھکرا دیا۔ وہ اپنی ذات میں گم رہے اور خدا کی طرف نہیں لپکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اِذَا قَرَأَ اَحَدُکُمْ وَالتِّیْنَ وَالزَّیْتُوْنَ فَاَتٰی عَلٰی آخِرِھَا (اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ) فَلْیَقُلْ بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ۔ جب تم میں سے کوئی شخص سورہ والتین والزیتون پڑھے اور اس کے آخر تک پہونچے تو اس کو چاہیے کہ وہ کہے کہ ہاں، اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا: سُبْحَانَکَ فَبَلٰی۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ ایک شخص جب اس کو پڑھے تو اس کے پڑھنے سے اس کی نفسیات میں ہلچل پیدا ہو۔ وہ قرآن کے مضامین کے مطابق ہر موقع پر مناسب جواب پیش کرتا چلا جائے۔

دلیل یا دھاندلی

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ہمیشہ بیّنہ (دلیل) پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کا سارا سرمایہ اندھی مخالفت اور دھاندلی ہوتا تھا۔ پیغمبر کی بات حقائق کی بنیاد پر ہوتی تھی اور ان کے مخالفین کی بات محض نفسانی سرکشی کی بنیاد پر۔

یہی موجودہ دنیا میں اہل حق اور اہل باطل کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ پیغمبر خدائی سچائی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی ہر بات مبنی برحقیقت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کے اتارے ہوئے علم کی بنیاد پر کہتا ہے، اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے، پوری کائنات اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے برعکس اس کے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں محض اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت کہتے ہیں، اس لیے ان کی بات کو علم وعقل کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہاں کوئی شخص سچ بولے تو اس کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو وہ بھی اپنی بات کے لیے الفاظ پالیتا ہے۔ لغت اور گرامر اس کا بھی ساتھ دیتے ہیں اور اس کا بھی۔

مگر یہ آزادی صرف موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں یہ آزادی آدمی سے چھن جائے گی۔ آخرت میں وہ اس سے عاجز ہوگا کہ وہ جھوٹ بولنے کے لیے الفاظ پاسکے۔ وہ دھاندلی کو بھی ایک صحیح رویہ بتائے اور ظالمانہ کارروائی کو بھی انصاف کہہ سکے۔

آج کی دنیا جھوٹ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہے۔ آخرت کی دنیا سچ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہوگی۔

آج کی دنیا میں لوگوں کو جھوٹ کی قیمت مل رہی ہے۔ فریب اور سازش کی بنیاد پر وہ مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب سراسر وقتی ہے۔ موت آتے ہی یہ تمام بنیادیں بالکل باطل ثابت ہوں گی۔ موت کے بعد آدمی جب اگلی دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل چکی ہوگی جس پر وہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ابدی طور پر بے جگہ ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ ابدی طور پر برباد بھی۔

اسلام کی آفاقیت

اسلام جب شروع ہوا اس وقت عرب کے شہر یثرب (مدینہ) میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک اوس اور دوسرے خزرج۔ یہ دونوں قبیلے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مگر جب ان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین توحید کی حقیقت کھلی اور وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو ان کی آپس کی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ دو دشمن گروہ ایک دوسرے کے دوست گروہ بن گیے۔ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آپس لڑنے والے لوگ متحد ہوکر بلند تر انسانی مفاد کے مجاہد بن گیے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دونوں قبیلے صرف اپنی اپنی بڑائی کو جانتے تھے۔ اوس کا قبیلہ خزرج پر بڑا بننے کی کوشش کرتا اور خزرج کا قبیلہ اوس کے اوپر بڑا بننا چاہتا۔ اس طرح دو بڑائیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان میں کبھی موافقت اور ہم آہنگی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مگر جب انھوں نے اسلام کے ذریعہ ایک خدا کی بڑائی کو دریافت کیا تو ان کی اپنی الگ الگ بڑائیاں ختم ہوگئیں اور صرف ایک سب سے اونچی بڑائی باقی رہی۔ پہلے دونوں قبیلے غیر مشترک بڑائیوں میں جی رہے تھے، اب دونوں ایک ہی مشترک بڑائی میں جینے لگے۔ یعنی خدا کی بڑائی، جس سے بڑا اور کوئی نہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی آفاقیت جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے۔ اسلام انسان کو توحید کا عقیدہ دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا ایک ہے۔ وہی سب کا خالق ہے۔ وہی سب کا مالک ہے۔ وہی سارے عالم کا نظام چلا رہا ہے۔ خدا ہی کے دیئے سے آدمی کو ملتا ہے۔ خدا نہ دے تو کوئی شخص کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ یہ توحید اسلامی آفاقیت کی بنیاد ہے۔

جب آدمی اس کامل توحید کو اختیار کرتا ہے تو اس کی نظر میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہو جاتی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو طرح طرح کے اونچ نیچ ہیں وہ اس کو مصنوعی نظر آنے لگتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو مختلف قسم کی دیواریں اٹھا دی گئی ہیں وہ سب ڈھ جاتی ہیں۔ ذات اور رنگ اور نسل اور جغرافیہ اور اس قسم کی دوسری بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں جو فرق کیا گیا ہے وہ سب مٹ جاتا ہے۔ ہر انسان بندہ بن جاتا ہے اور ایک خدا سب کا معبود۔

توحید کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی عالمی ذہن پیدا کرتا ہے۔ جس خدا کی طرف ایک انسان

دوڑتا ہے اسی خدا کی طرف تمام انسان دوڑنے لگتے ہیں۔ جس خدا کے سامنے ایک انسان اپنی بڑائی کو چھوڑتا ہے۔ اسی کے سامنے تمام انسان اپنی بڑائی کو چھوڑنے والے بن جاتے ہیں۔ توحید کے بغیر ہر انسان کی توجہ کا مرکز الگ ہوتا ہے، توحید کے تحت ہر آدمی کی توجہ کا مرکز ایک ہو جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی آفاقیت ہے، اس سے بڑی آفاقیت اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔

عرب قوم ہزاروں سال سے عرب کے جغرافیہ میں آباد تھی۔ مگر تاریخ میں اس کا کوئی کارنامہ لکھا نہ جا سکا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ شاعری کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑ جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ان کے درمیان ایک لڑائی چھڑتی تو وہ نسل در نسل سیکڑوں سال تک جاری رہتی۔

مگر یہی عرب تھے کہ جب اسلام کے زیر اثر ان کے اندر فکری انقلاب آیا تو انھوں نے ایک عالمی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے محدود جغرافیہ سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گیے۔ جو لوگ اس سے پہلے ناقابل ذکر سمجھے جاتے تھے انھوں نے تمام قابل ذکر علوم میں اپنے وقت کی سب سے بڑی ترقیاں کیں۔ عربی زبان جو اس سے پہلے صرف ایک مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایک بین اقوامی زبان بن گئی۔

اس کی وجہ اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت تھی۔ اسلام نے ان کے بند ذہن کو کھول دیا۔ وہ نیچر کو پوجتے تھے، اسلام نے بتایا کہ نیچر تو مخلوق ہے اور بے بس ہے۔ پوجنے کے قابل تو صرف خدا کی ذات ہے جو تمہارا اور تمام دنیا کا مالک ہے۔ اس سے ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ نیچر جھکنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس کی تحقیق اور تسخیر کی جائے۔ وہ انسان کو عرب اور عجم، کالے اور گورے، آزاد اور غلام، اونچی نسل اور نیچی نسل میں بانٹے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان پر کھولا کہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں، ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ان کے اندر وہ عالمی اور آفاقی ذہن پیدا ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنا وطن اور ساری انسانیت کو اپنا کنبہ سمجھ لیا۔ اسلام سے پہلے وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو رہے تھے۔ اسلام کے بعد وہ ساری دنیا کے شریک اور ساتھی بن گیے۔

اسلام سے پہلے عرب کے لوگ قبائلی دور میں جی رہے تھے، اسلام کی بنیاد پر جب فکری انقلاب آیا تو اس نے ان کو ایک بین اقوامی گروہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ان کی نظر چھوٹے چھوٹے مقاصد تک محدود تھی، اسلام کے بعد ان کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ وہ خشکی اور تری کو

پار کر کے ساری دنیا تک وسیع ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی پہاڑ نہ رہا جو ان کی نظر کو روکے اور کوئی سمندر نہ رہا جو ان کے سفر میں حائل ہو۔

اسلام نے عربوں کے اندر جب آفاقیت پیدا کی تو ان کا یہ حال ہوا کہ قبیلہ کی سرداری پر فخر کرنے والے لوگ عالم کے امام بن گیے۔ ان کے اندر ابن سینا اور الرازی جیسے ماہرین طب پیدا ہوئے جن کی طبی کتابوں کے یورپ کی زبان (لاتینی) میں ترجمے ہوئے اور یورپ کے میڈیکل کالجوں میں وہ بطور نصاب داخل کی گئیں۔ ان میں الادریسی جیسا جغرافیہ داں پیدا ہوا جس نے سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے لیے سب سے پہلا دنیا کا نقشہ بنایا۔ ان میں ایسے ماہرین صنعت پیدا ہوئے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اوفارکس نے اپنے یہاں سونے کا سکہ ڈھالنے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے۔

انھوں نے فن جہاز رانی میں اتنی ترقی کی کہ ان کے یہاں احمد بن ماجد جیسا شخص پیدا ہوا جس نے واسکوڈی گاما کی بحری رہنمائی کی جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرنے کے لیے نکلا تھا۔ ان کے یہاں ابو عبیدہ مسلم البلنسی جیسے زمینی علوم کے ماہر پیدا ہوئے جن کی تحقیقات کو پڑھ کر کولمبس کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہاں کچھ اور بھی دنیائیں ہیں جن کو دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی شعور اور حوصلہ کے تحت وہ یورپ کے ساحل سے روانہ ہوا اور آخر کار نئی دنیا (امریکہ) کو دریافت کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک کائناتی دین اور ایک آفاقی نظریہ ہے اور اسلام کی بنیاد پر بننے والی تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ اسلام کی آفاقیت صرف نظریاتی چیز نہیں، وہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔

اسلام کے آفاقی اصولوں کا بہت اچھا اظہار اس واقعہ میں ہے جس کا تعلق ربعی بن عامرؓ اور رستم (ایرانی سردار) سے ہے۔ عرب جب قدیم ایران میں داخل ہوئے اور ایرانیوں کو ہر جگہ ان کے مقابلہ میں شکست کھانی پڑی، تو رستم نے ربعی بن عامر کو اپنے دربار میں بلایا۔ رستم اس وقت ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا۔ رستم اپنے شاندار دربار میں سونے اور جواہرات کا تاج پہنے ہوئے عالی شان تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ربعی بن عامرؓ بالکل معمولی کپڑے اور معمولی حالت میں تھے۔ رستم نے پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے۔ ربعی بن عامرؓ نے جواب دیا:

اللّٰہُ ابتعثنا واللّٰہُ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللّٰہ ومن ضیق الدنیا الیٰ سعتھا ومن جور الادیان الیٰ عدلِ الاسلام۔

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے اور اللہ ہم کو یہاں لے آیا ہے تاکہ جس کے بارہ میں وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کو اس کی وسعت میں پہونچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دے کر اس کو اسلام کے عدل و انصاف میں لے آئیں۔

ربعی بن عامرؓ نے اپنے اس قول میں نہایت مختصر طور پر مگر نہایت فصاحت کے ساتھ اسلام کے آفاقی اصولوں کو بیان کر دیا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر جب ایک شخص کے اندر فکری انقلاب آتا ہے تو وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔ وہ کائنات کے مالک کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے جو تمام تنگیوں اور محدودیتوں سے بلند ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں کی سطح پر جی رہا تھا، اب وہ خدا کی سطح پر جینے لگتا ہے جو تمام آفاق سے اوپر ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ ایک خول کے اندر تھا تو اب وہ خول کے باہر کی وسیع دنیا میں اپنے لیے زندگی کے مواقع پالیتا ہے۔

عام حالت میں آدمی بندوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ بس اپنے قدموں کے نیچے کی زمین کو جانتا ہے۔ مگر جب وہ خدا کو پاتا ہے اور خدا کا عبادت گزار بنتا ہے تو وہ انسانوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ انسانی دوستیاں اور دشمنیاں اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہیں۔ وہ انسانی شکایتوں اور انسانی محبتوں سے گزر جاتا ہے۔ اس کی روح لامحدود پنہائیوں میں سفر کرنے لگتی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اُلجھنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

خدا کو پانے سے پہلے آدمی دنیا کی محدودیتوں میں گم رہتا ہے۔ خدا کو پانے کے بعد وہ دنیا کی محدودیتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں اور اپنے حوصلوں کی تسکین کے لیے بلند تر سطح پالیتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کھونا بھی پانا بن جاتا ہے۔ جہاں ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جہاں غم بھی اتنا ہی اہم بن جاتا ہے جتنا خوشی اور مسرت۔

پھر اسلام آدمی کو انسانی موشگافیوں والے دین سے نکالتا ہے۔ وہ آدمی کو جھوٹے رسم ورواج والے مصنوعی دین سے باہر لاتا ہے۔ وہ اس کو اس سچے دین سے آشنا کرتا ہے جہاں ایک طرف انسان ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا۔ جہاں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں، جہاں خدا سے ملنے کے لیے رسم ورواج کے بندھنوں میں اپنے کو باندھنے کی ضرورت نہیں۔

خدا ہر آن اپنے بندوں تک پہونچا ہوا ہے، اسی طرح خدا کے بندے بھی ہر آن خدا تک پہونچ سکتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں، اس لیے خدا اور بندے کے ملاپ کے لیے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت بھی نہیں۔ انسان جب اس ابدی دنیا میں پہونچتا ہے تو وہ خدا کو بھی عین اسی مقام پر پالیتا ہے جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔

اسلام توحید کا دین ہے۔ اسلام میں خدا ایک ہے اور ساری خدائی بھی اسی ایک ذات کو حاصل ہے۔ جو لوگ اس خالص توحید کو پالیں وہ ایسی لامحدود دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں آفاقیت ہی آفاقیت ہے، اور جہاں ابدیت ہی ابدیت۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو (بمبئی) سے ۷ اکتوبر ۱۹۸۶ کو نشر کی گئی۔

والدین کی ذمہ داری

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما من مولود یولد الا علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا اس کو نصرانی بنا دیتے ہیں یا اس کو مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس کا مطلب صرف مذہبی معنوں میں یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنانا نہیں ہے۔ یہ تو بنانے کی آخری صورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر وہ بگاڑ شامل ہے جو والدین کے ذریعہ ان کی اولاد میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں عمومی الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً :

عن جابرؓ بن عبد الله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کل مولود یولد علی الفطرة حتی یعرب عنه لسانه فاذا عبر عنه لسانه اما شاکرا و اما کفورا۔

حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بولنے لگے۔ پھر جب وہ بولنے لگتا ہے تو وہ شکر گزار یا ناشکر بن جاتا ہے۔

بچے پیدا ہوتے ہی بولنے نہیں لگتے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد بولتے ہیں۔ بولنے سے پہلے ان کا ربط ان کی پیدائشی فطرت سے ہوتا ہے، بولنے کے بعد ان کا ربط ان کے قریبی ماحول سے ہو جاتا ہے جو کچھ ملے اس پر اللہ کا شکر کرنا ہے یا اس کو کسی اور کا عطیہ سمجھنا ہے، اس کا ابتدائی سبق انھیں اپنے ماں باپ سے ملتا ہے۔ کسی کو چھوٹا دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنا یا کسی کو بڑا دیکھ کر جل اٹھنا، یہ بھی پہلی بار ان کو اپنے والدین ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح والدین یا تو اپنے بچوں کو نیک عمل بناتے ہیں یا ان کو بد عمل بنا دیتے ہیں۔ بچہ کا گھر اس کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور بچہ کے والدین اس کے سب سے پہلے معلم۔

آزمودہ حل

میرے ایک قریبی عزیز ہیں وہ ہندستان کے ایک شہر میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے ۲۴ کمروں کا ایک بڑا مکان بنایا۔ اس سے ملا ہوا ایک ہندو ٹھیکہ دار کا بھی کافی بڑا مکان تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خالی زمین تھی۔ اس زمین کے بارے میں دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ میرے عزیز کہتے تھے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہندو ٹھیکہ دار کا دعوی تھا کہ وہ ہماری زمین ہے۔

یہ نزاع جاری رہی یہاں تک کہ ہندو ٹھیکیدار نے اس معاملہ میں مقامی جن سنگھی عناصر کو ابھارا۔ ٹھیکہ دار نے ان لوگوں کو بتایا کہ میری زمین پر ایک "مسلمان" نے قبضہ کر رکھا ہے۔ جن سنگھی افراد قدرتی طور پر بھڑک اٹھے۔ چنانچہ ایک روز ان کی پوری جماعت جلوس کی شکل میں آئی اور مذکورہ مسلمان کے مکان کو گھیر لیا۔ وہ جذبات میں بھرے ہوئے تھے اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔

مذکورہ مسلمان عمارت کے اوپر کے حصہ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے ان کا کاروباری دفتر تھا۔ وہ شور سن کر دفتر سے باہر آئے اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ تم نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے اور بہت سی اشتعال دلانے والی باتیں کہیں۔ مگر مذکورہ مسلمان ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ میں لیڈر کون کون ہیں۔ چند لوگ آگے بڑھے۔ انھوں نے ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ یہیں سڑک پر ٹھہریئے۔ ابھی زمین کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لیڈر صاحبان کو اپنے دفتر میں لے آئے۔

یہ گرمی کا موسم تھا۔ پہلے انھوں نے لیڈر صاحبان کی کولڈ ڈرنک سے تواضع کی۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ اب بتائیے آپ لوگوں نے کس لیے زحمت فرمائی ہے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ آپ نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کو اصل مالک کے حوالہ کیا جائے۔ مذکورہ مسلمان نے نہایت ٹھنڈے انداز میں کہا کہ آپ سب پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کاغذ پر ہوتی ہے۔ یعنی کاغذ یہ فیصلہ کرتا ہے

کہ زمین کس کی ہے اور کس کی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا۔ اس طرح جب مذکورہ مسلمان نے جن سنگھی لیڈروں سے یہ اقرار کرالیا کہ زمین کا مسئلہ کاغذ کو دیکھ کر طے ہوتا ہے تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب میں اس مسئلہ میں خود آپ لوگوں کو جج بناتا ہوں۔ میرے پاس جو کاغذات ہیں وہ میں آپ کو دے رہا ہوں۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس جو کاغذات ہیں وہ آپ ان سے لے لیں۔ اور دونوں کو لے کر اطمینان کے ساتھ گھر جائیں۔ تمام کاغذات کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ دیدیں۔ اور میں پیشگی طور پر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ مجھ کو بلا شرط منظور ہوگا۔

اب جن سنگھی لیڈروں کا موڈ بدل گیا۔ ہندو ٹھیکیدار نے مذکورہ مسلمان کی جو تصویر بتائی تھی، عملی تجربہ میں انھوں نے ان کو اس سے بالکل مختلف پایا۔ جن سنگھی لیڈروں کی رہنما اب تک ہندو ٹھیکہ دار کی غلط رپورٹ تھی، اب ان کا رہنما ان کا وہ ضمیر بن گیا جو خدا نے ان کے سینہ کے اندر پیدا کیا تھا۔ چنانچہ وہ کاغذات کو لے کر دفتر سے باہر آئے اور ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ "میاں صاحب" نے فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ ہم سوچ کر اس معاملہ کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ یہ کہ ان لوگوں نے کاغذات دیکھنے کے بعد مکمل طور پر مذکورہ مسلمان کے حق میں اپنا فیصلہ دیدیا۔

یہ واقعہ ۱۹۶۵ کا ہے اور اتر پردیش کے ایک شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے تمام اہم کردار آج بھی زندہ موجود ہیں۔ کوئی شخص تصدیق کرنا چاہے تو میں اس کو نام اور پتے دیدوں گا، وہ اصل مقام پر جاکر اس کی مکمل تصدیق حاصل کر سکتا ہے۔

حال میں بابری مسجد (اجودھیا) اور عیدگاہ (متھرا) وغیرہ کے مسائل پیدا ہوئے تو مجھ کو بار بار مذکورہ واقعہ یاد آتا رہا۔ خیال ہوا کہ کاش مسلمانوں کے لیڈر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہوتے تو وہ اس طرح کے قومی مسائل میں بھی وہی تدبیر اختیار کرتے جو مذکورہ مسلمان نے اپنے ذاتی مسئلہ میں اختیار کی اور صد فی صد کامیابی حاصل کی۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقینی طور پر یہ مسائل نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جاتے۔ اور آئندہ کے لیے اس قسم کے نئے مسائل پیدا ہونے کا دروازہ بھی بند ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں کے نادان لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کو جوابی ہنگامہ آرائی کا عنوان بنا لیتے ہیں۔ پرجوش تقریریں کرنا اور سڑکوں پر جلوس اور نعروں کے مظاہرے کرنا، یہی آخری بات ہے جو ان کی عقل انھیں بتاتی ہے۔ یہ طریق کار ممکن ہے کہ لیڈروں کی اپنی لیڈری کے لیے مفید ہو، مگر اصل مسئلہ کی نسبت سے وہ برعکس نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہے۔ ایک مسئلہ جو ابتداءً محض چند مفاد پرست افراد کا مسئلہ تھا، مظاہراتی طریق کار اختیار کرنے کے بعد وہ قومی مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ دونوں گروہوں کے لیے ساکھ (prestige) کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ملک کے سیاسی حکمراں اگر کچھ کر سکتے تھے تو وہ بھی اب کرنے سے رک جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا تو اس کی انھیں یہ قیمت دینی پڑے گی کہ الکشن کے موقع پر وہ اس فرقہ کے ووٹوں سے محروم ہو جائیں جس کے خلاف انھوں نے اپنا فیصلہ دیا ہے۔

اس کے برعکس اگر مسلمان لیڈر یہ کرتے کہ وہ سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اعلیٰ سطح کے لوگوں سے ملاقات کرتے اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھتے کہ دونوں فرقوں کے باخبر اور قابلِ اعتماد افراد پر مشتمل کمیٹی بنائی جائے اور وہ تاریخی حقائق کا بے لاگ جائزہ لے کر فیصلہ کرے۔ نیز جرأت مندانہ طریقہ اختیار کر کے وہ مذکورہ مسلمان کی طرح یہ بھی کہہ دیتے کہ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی اس کو ہم بلا شرط مان لیں گے۔ مسلمان لیڈر اگر یہ طریقہ اختیار کرتے تو یقینی طور پر مسئلہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا۔

اس رائے کا درست ہونا اس واقعہ سے بھی ثابت ہے کہ متعدد ہندو صاحبان نے اس معاملہ میں کھل کر اپنی قوم کے فرقہ پرستوں کی تردید کی ہے۔ اور اس موضوع پر نہایت منصفانہ مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضامین نئی دنیا (دہلی) تعمیر حیات (لکھنؤ) نقیب (پٹنہ) اور دعوت (دہلی) وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان اخبارات کی ۱۹۸۶ کی فائل میں ان مضامین کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر ان مضامین سے سبق لیا جائے تو وہ راقم الحروف کی تجویز کی معنویت ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔

یہاں میں اس نوعیت کی صرف ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مفصل خط ہے جو نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶) میں چھپا ہے۔ اس خط کے نیچے ۱۲ آدمیوں کے نام درج ہیں۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان میں سے ۱۱ افراد ہندو فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خط نہایت منصفانہ ہے۔ وہ اگلے صفحہ پر اصل الفاظ میں پورا نقل کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ ترین سطح کے ان ہندو دانشوروں نے اپنے خط میں سخت تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اخبار ٹائمس آف انڈیا اپنی خبروں اور اپنے ادارتی نوٹ کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہا ہے۔ اس کی ایک مثال متھرا کی عیدگاہ کے بارہ میں اس کی رپورٹ ہے جس کو "اورنگ زیب کے بعد کرشنا کی جائے پیدائش" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ قدیم کیشو مندر کو راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے جہاں گیر کے زمانہ میں بنوایا تھا، اورنگ زیب نے اس مندر کو گرا کر عیدگاہ تعمیر کرائی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس نے سیاسی بنیاد پر ایسا کیا۔ کیونکہ متھرا کے علاقہ میں بندیلہ اور جاٹ اس کے باغی ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بے شمار دوسرے مندروں کو اورنگ زیب نے بالکل نہیں چھوا، حتیٰ کہ کئی نئے مندر اسی کے زمانہ میں بنوائے گئے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود یہ کیشو مندر بدھ مذہب کے عبادت خانہ کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ یہ تاثر دیتی ہے کہ یہ مقام کرشنا کی جنم بھومی ہے۔ یہ بات اس وقت بہت عجیب معلوم ہوتی ہے جب اس حقیقت کو دھیان میں رکھا جائے کہ خود کرشنا کا وجود تاریخی طور پر مشتبہ ہے۔ یہی معاملہ اجودھیا کی رام جنم بھومی کا ہے۔ یہ بات جائز طلب ہے کہ کیا تاریخی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جگہ رام کی جائے پیدائش تھی۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ۱۹ ویں صدی تک یہاں ہندو اور مسلم کی جو نزاع تھی وہ خود بابری مسجد کے بارہ میں نہ تھی بلکہ مسجد سے الگ ایک اور جگہ کے بارے میں تھی جس کو ہنومان بیٹھک کہا جاتا تھا۔

ہندستان میں غیر رواداری کا مظاہرہ ہر مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے ہوتا رہا ہے

Communal Twist

Sir, — We have noted with growing concern a recent tendency in *The Times of India* to give a communal twist to news items and even to editorial comments. An example of this is a report from Mathura dated 15 September and entitled, "Krishna's Birthplace after Aurangzeb." It evoked considerable correspondence, some of which, as could be expected, was markedly communal in tone.

Your readers should know that historical analysis and interpretations involve more than a mere listing of dates with an eye to pious sentiments. The Dera Keshava Rai temple was built by Raja Bir Singh Deo Bundela during Jahangir's reign. This large temple soon became extremely popular and acquired considerable wealth. Aurangzeb had this temple destroyed, took the wealth as booty and built an Idgah on the site. His actions might have been politically motivated as well, for at the time when the temple was destroyed he faced problems with the Bundelas as well as Jat rebellions in the Mathura region. It should be remembered that many Hindu temples were untouched during Aurangzeb's reign and even some new ones built. Indeed, what is really required is an investigation into the theory that both the Dera Keshava Rai temple and the Idgah were built on the site of a Buddhist monastery which appears to have been destroyed.

Your news report also gives credence to the suggestion that this site was the birthplace of Krishna. This is extraordinary to say the least, when even the historicity of the personality is in question. It creates the kind of confusion such as has been created, probably deliberately, over the question of the birthplace of Rama in the matter of Rama-Janam-bhumi. A Persian text of the mid-nineteenth century states that the Babari mosque was adjacent to the Sita-ka-rasoi-ghar and was known as the Rasoi Sita mosque and adjoined the area associated with the birthplace of Rama. It would be worth enquiring whether there is reliable historical evidence of a period prior to the nineteenth century for this association of a precise location for the birthplace of Rama. Furthermore such disputes as there were between Hindus and Muslims in this area upto the nineteenth century were not over the Babari mosque but the totally different site of Hanuman-baithak.

It cannot be denied that acts of intolerance have been committed in India by followers of all religions. But these acts have to be understood in their context. It is a debasement of history to distort these events for present day communal propaganda.

The statement in your news report that the site at Mathura is to be "liberated" and handed over to the "rightful owners" as the birthplace of Krishna raises the question of the limits to the logic of restoration of religious sites (and this includes the demand for the restoration to worshippers of disused mosques now under the care of the Archaeological Survey of India). How far back do we go? Can we push this to the restoration of Buddhist and Jaina monuments destroyed by Hindus? Or of pre-Hindus animist shrines?

ROMILA THAPAR, MUZAFFAR ALAM, BIPAN CHANDRA, R. CHAMPAKA LAKSHMI, S. BHATTACHARYA, H. MUKIHA, SUVIRA JAISWAL, S. RATNAGAR, M.K. PALAT, SATISH SABERWAL, S. GOPAL, MRIDULA MUKHERJEE.

The Times of India, New Delhi, 21, Oct. 1986.

نگران جھگڑوں کو ان کے سیاق میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ یہ تاریخ کی تلبیس ہوگی کہ ان چیزوں کو فرقہ وارانہ مقاصد کے لیے بگاڑ کر پیش کیا جائے۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ متھرا کے اس مقام کو دوبارہ حاصل کیا جائے اور اس کو اس کے اصل مالکوں کے حوالہ کیا جائے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منطق کی حد کیا ہے اور اس کو آپ کتنے پیچھے تک لے جائیں گے۔ کیا اس کو ہم یہاں تک لے جائیں گے کہ بدھوں اور جینیوں کے ڈھائے ہوئے مندروں کے مقامات دوبارہ انھیں لوٹائے جائیں اور کیا اسی طرح قدیم ہندستانی باشندوں کے چھینے ہوئے مقدس مقامات بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶)

اوپر جو خط نقل کیا گیا، یہ اول درجہ کے ہندو صاحبان کا خط ہے جو ملک کے اول درجہ کے انگریزی اخبار میں چھپا ہے۔ یہ اعترافِ حق اس وقت ہے جب کہ ہم نے ابھی تک ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حَکَم نہیں بنایا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حَکَم کے مقام پر بٹھا دیا جائے تو وہ کس قسم کا اور کیسا فیصلہ کریں گے، بشرطیکہ سیاسی طریقہ اختیار کر کے مسئلہ کو قومی ساکھ کا مسئلہ نہ بنا دیا گیا ہو۔

دو قسم کے انسان

مکی دور کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گئے۔ ان کو اللہ کی طرف بلایا اور ان سے کہا کہ دعوت حق کے اس کام میں میری مدد کرو۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ اس کا نام بحیرہ بن فراس تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیں پھر اللہ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد اقتدار (امر) میں ہمارا حصہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا اقتدار اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقال له افنهدف نحورنا للعرب دونك فاذا اظهرك الله كان الامر لغيرنا؟ لاحاجة لنا بامرك فابوا عليه۔

(سیرت ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۳۳)

اس نے آپ سے کہا کیا ہم آپ کی حمایت میں اپنے سینہ کو سارے عرب کا نشانہ بنائیں پھر جب اللہ آپ کو غلبہ دیدے تو اقتدار ہمارے سوا دوسرے کا ہو جائے۔ ہم کو آپ کے دین کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک قسم کے انسان کی مثال تھی۔ اب دوسرے قسم کے انسان کی مثال لیجئے۔

مکی زندگی کے آخری زمانہ میں مدینہ کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو ان میں کا ایک شخص اٹھا۔ یہ عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے قبیلہ خزرج کے لوگو کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ کہا کہ تم تمام سرخ و سفید کے خلاف جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اس میں تمہارے اموال برباد ہوں گے اور تمہارے بہترین افراد قتل کیے جائیں گے؛

قالوا فانا ناخذه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف۔ فما لنا بذلك يا رسول الله ان نحن وفينا۔ قال الجنة۔ قالوا ابسط يدك فبسط يده فبايعوه۔

(الجزء الثانی، ۵۵)

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو اموال کی ہلاکت اور افراد کے قتل کے باوجود قبول کرتے ہیں۔ پھر اے خدا کے رسول ہمارے لیے کیا ہے اگر ہم اس کو پورا کر دیں۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے۔ آپ نے ہاتھ بڑھایا اور پھر انھوں نے بیعت کی۔

ہم کو فائدہ ہے

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ وہ اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے ہیں۔ ابتداءً ان کا اخبار عرصہ تک خسارہ پر چلتا رہا۔ مگر اب وہ نفع پر چل رہا ہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جب اپنا اخبار نکالا تو کوشش کے باوجود اس کی اشاعت کسی طرح تین ہزار سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ اسی حالت میں لمبی مدت گزر گئی۔ انھوں نے ہر قسم کی تدبیریں کر ڈالیں مگر اخبار کی اشاعت نہیں بڑھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ میں اجودھیا کی مسجد کا معاملہ پیش آیا جو مسلمانوں کے نزدیک "بابری مسجد" ہے مگر ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ وہ "رام جنم بھومی" ہے۔ مذکورہ لیڈر نے فوراً اس کو پکڑ لیا۔ انھوں نے اس موضوع پر مسلسل دھواں دھار مضامین شائع کیے، اور ان پر تیز و تند سرخیاں قائم کیں۔ نتیجہ عین اندازے کے مطابق نکلا۔ ان کے اخبار کی اشاعت اچانک تین ہزار سے بڑھ کر تیس ہزار تک پہونچ گئی۔ ان کے پاس ہر طرف سے تحسین اور مبارک باد کے خطوط آنے لگے۔

بابری مسجد جیسے واقعات مسلم ملّت کے لیے بری خبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ مسلم قیادت کے لیے اچھی خبر بن جاتے ہیں۔ وہ ایک کے لیے المیہ ہیں اور دوسرے کے لیے طربیہ ——— یہ کہانی محض ایک صحافی لیڈر کی کہانی نہیں، یہی ہماری تمام قیادت اور صحافت کی کہانی ہے۔

مذکورہ روداد سن کر مجھے ایک صاحب کا قصہ یاد آگیا۔ وہ ایک دیہاتی مسلمان تھے۔ وہ اکثر قبروں اور درگاہوں پر جاتے اور وہاں مرادیں مانگتے۔ بستی کے ایک عالم نے ان کو اس سے منع کیا اور کہا کہ قبروں سے مرادیں مانگنا شرک ہے۔ عالم کے نزدیک اس قسم کا فعل شرک تھا۔ مگر مذکورہ دیہاتی مسلمان کا "تجربہ" تھا کہ وہ صاحب قبر سے جو مراد مانگتا ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس نے لڑکا مانگا تو اس کے یہاں لڑکا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ عالم کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے چلّا کر کہا:

ہم تو جائیں گے، ہم کو فائدہ ہے

راقم الحروف پچھلے بیس سال سے مسلم رہنماؤں کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ جذباتی

سیاست کا طریقہ چھوڑ دیں اور خاموش تعمیر کا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے لیے میں نے اکابرِ ملّت ملاقاتیں کیں۔ ان سے خط و کتابت کی۔ تحریروں کے ذریعہ مسلسل انھیں متوجہ کیا۔ اور دلائل اور مثالوں سے اس کو اس حد تک واضح کر دیا کہ کسی کے پاس اس کی تردید میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسلم رہنما اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں بھی اصل سبب وہی ہے جس کا نمونہ دیہاتی مسلمان کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ ہر رہنما گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے :

ہم جذباتی سیاست چلائیں گے، اس سے ہم کو فائدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی صحافت اور قیادت دونوں فسادات کے اوپر قائم ہیں۔ اس ملک میں اگر فرقہ وارانہ فسادات ختم ہو جائیں تو اسی کے ساتھ اس ملک کی مسلم صحافت اور مسلم قیادت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اردو کے ایک تجربہ کار صحافی جناب ساجد رشید نے اسی بات کو ان الفاظ میں لکھا ہے :

"اردو کے بیشتر اخبارات کا محبوب موضوع فساد ہے، اور وہ بھی صرف ہندو مسلم فساد۔ اردو اخبارات فساد کی خوفناک خبروں کے بغیر نیا شمارہ چھاپنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ایک ہفت روزہ اخبار کے نوجوان مدیر نے ایک بار مجھ سے کہا : "بھائی، کہیں پر ایک آدھ فساد ہو جائے تو اخبار کی اشاعت بڑھ جائے۔" بیشتر اردو صحافی آج اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی اردو ہفت روزہ کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، وہ مسلمانوں کی کچھ ایسی تصویر کشی کرے گا گویا اس سے زیادہ مظلوم قوم کوئی دوسری نہیں۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ مسلمان اس دیس کی فرقہ وارانہ آگ کا ایندھن ہیں۔ لیکن اردو کے صحافی اس کو جس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، اس سے مسلمانوں پر منفی اثرات مترتب ہو رہے ہیں۔ مسلمان خود کو بے حد مظلوم اور غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ آدمی کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کو اس بری طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نقطہ سے غور کریں تو پتہ چلے گا کہ بیشتر اردو اخبارات ایک پوری قوم کو مفلوج کرنے کی خطرناک سازش میں غیر محسوس طریقہ سے ملوث ہیں۔" (روزنامہ اردو ٹائمز، بمبئی، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۶)

ایک تقریر

اس وقت میری گفتگو کا موضوع خدا اور خدا کی وحدت کا موضوع ہے۔ یہ موضوع بلاشبہ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع ہے۔ زمین و آسمان گواہ ہیں کہ میں سب سے زیادہ توحید کے موضوع پر سوچتا ہوں۔ میں سب سے زیادہ خدا کی باتوں میں گم رہتا ہوں۔

مگر قرآن میں آیا ہے کہ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں) اور فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی کی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا)

خدا تو وہ ہے جہاں زبانیں بند ہو جاتی ہیں، پھر خدا کے بارے میں بولا جائے تو کیا بولا جائے۔ خدا تو وہ ہے جس کے سامنے آتے ہی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے مشاہدہ کو بیان کیا جائے تو کس طرح بیان کیا جائے۔ خدا تو وہ ہے کہ جب وہ اترتا ہے تو جہاں وہ اترتا ہے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر کہاں سے وہ دل لایا جائے جو خدا جیسی ہستی کا چرچا کر سکے۔

خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں، خدا میری دریافت ہے۔ خدا کو میں نے دیکھا ہے۔ خدا کو میں نے چھوا ہے۔ بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے جس پر خدا اترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دیئے۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا پر بولنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا کا بکھان کرنا عام تقریروں کی طرح صرف ایک تقریر کر دینے کی بات نہیں۔

غالباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں اعظم گڈھ (یوپی) میں تھا۔ وہاں ایک صاحب (شاہ نصیر احمد) نے مجھ سے پوچھا: "کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے"، میری زبان سے فوراً یہ الفاظ نکلے: "کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا سورج اور چاند سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ آنکھ اسی لیے دی گئی ہے کہ وہ خدا کو دیکھے۔ یہ دماغ اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ خدا کا ادراک کرے۔ بخدا وہ آنکھ بے نور ہے جس کو خدا دکھائی

نہیں دیتا۔ وہ انسان بے دماغ ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا، یا یہ کہ خدا کو پایا نہیں جا سکتا۔

خدا بلاشبہ اتنا بڑا ہے کہ وہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں سماتا۔ مگر بلاشبہ وہ تمام چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم خدا کو اس کی ذات میں نہیں دیکھ سکتے۔ مگر خدا کو اس کی صفات میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں اور ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں یہی خدا کو دیکھنا ہے، یہی خدا کو پانا ہے۔

کار کو کارخانہ کا انجینیر بناتا ہے۔ انجینیر کار میں ہر وقت بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ مگر جس شخص نے کار میں صرف کار کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ کار کو دیکھنے والا وہ ہے جو کار کو دیکھتے ہی اس کے انجینیر کو بھی دیکھ لے۔ اسی طرح انسان خدا کو دیکھتا ہے۔ اگر آپ نے سورج میں صرف سورج کو دیکھا تو آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ سورج کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے سورج میں خدا کے روشن چہرہ کو دیکھ لیا ہو۔ جس نے پہاڑ میں صرف پہاڑ کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ پہاڑ کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے پہاڑ میں خدا کی عظمتوں کو پا لیا ہو۔ خدا کوئی دور کی چیز نہیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ چڑیوں کے چہچہے میں بول رہا ہے۔ وہ پھولوں کی لطافت میں مسکرا رہا ہے۔ وہ ہواؤں کے جھونکے میں آپ کو چھو رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا ہر طرف اور ہر جگہ ہے۔ وہ ہم سے بالکل الگ ہے، اسی کے ساتھ وہ ہم سے انتہائی قریب ہے۔ پھر بھی جو انسان خدا کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے۔ اس کے باوجود جو انسان خدا کو نہ پائے وہ محرومی کی اس انتہا پر ہے جس کے آگے محرومی کا کوئی درجہ نہیں۔

خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو پانا۔ کون ہے جو اپنے آپ کو پائے ہوئے نہ ہو۔ اس لیے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو خدا کو پانا چاہے پھر بھی وہ اس کو نہ پا سکے۔ جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے وہ سورج کو نہیں دیکھتا۔ ایسے شخص کے چاروں طرف سورج اپنی بے پناہ روشنی کے ساتھ موجود ہوگا مگر وہ سورج کو نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح خدا ہر لمحہ آدمی کے چاروں طرف موجود ہے۔ مگر جس شخص نے اپنی بصیرت کو کند کر لیا ہو وہ کبھی خدا کو دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔

بھوپال، ۱۹ اپریل ۱۹۸۶

اسلام پسندوں کے مسائل

ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۷ تک پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور پاکستان کے دوسرے اسلام پسند لوگوں نے ان کے خلاف تحریک چلائی اور اس کا نام "نظامِ مصطفےٰ" رکھا۔ اتھارٹی کے خلاف عوام کو ابھارنا سب سے زیادہ آسان کام ہے۔ چنانچہ ان حضرات کی پرجوش تقریروں سے پاکستانی عوام بھڑک اٹھے۔ یہاں تک کہ بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اسلامی محاذ کے دوسرے لوگوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ تاثر دیا تھا کہ بھٹو کا جانا پاکستان میں اسلام کا آنا ہے۔ مگر بھٹو کے جانے کے بعد جو چیز پاکستان میں آئی وہ اسلامی محاذ کا آپس کا اختلاف تھا نہ کہ مثبت معنوں میں اسلام۔

یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں بار بار پیش آیا ہے، کہیں ایک صورت میں اور کہیں دوسری صورت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "انقلاب" سے پہلے صرف ایک دشمن مشترک طور پر سب کا مرکز توجہ ہوتا ہے۔ مگر مشترک دشمن کے ہٹنے کے بعد جب تعمیر کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر ملک کے بارے میں ہر ایک کے ذہن میں الگ الگ نقشہ ہے۔ بس یہاں سے اختلاف شروع ہوجاتا ہے۔ منفی بنیاد پر متحد ہونے والے مثبت بنیاد پر متحد ہونے میں ناکام رہتے ہیں۔

یہ اختلافات کس قسم کے مسائل میں پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ پاکستان کا ایک اردو ہفت روزہ "دیدشنید" ہے۔ اس نے پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کے سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا: "اچھا اگر آپ کی حکومت ملک میں قائم ہوجائے تو آپ کے پاس تو پورے اختیار ہوں گے۔ قومی زندگی میں خواتین کی شرکت کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہوگا۔ آپ کہاں تک اجازت دیں گے"۔

اس سوال کے جواب میں تنظیم اسلامی کے امیر نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی: "ہم پرائمری تعلیم پوری عورتوں کے حوالہ کردیں گے۔ ہم پابندی لگادیں گے کہ کوئی مرد پرائمری

ٹیچر نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بچوں کی صحیح طور پر عورت ہی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ مادرانہ شفقت صرف عورت ہی دے سکتی ہے۔" ماہنامہ میثاق، لاہور، ستمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۶۶)

اب اسی موضوع پر دوسرے اسلام پسند کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ احمد محمد جمال سعودی عرب کے مشہور اسلامی مفکر ہیں۔ وہ فکری طور پر اخوان کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ (یکم ستمبر ۱۹۸۶) میں ایک پرجوش مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے: الفتنة نائمة ..... لعن الله من ایقظها۔ (فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے) یہ مضمون عین اسی مسئلہ کے بارے میں ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

سعودی عرب میں اس وقت تعلیم کا پورا نظام مردوں کے ہاتھ میں ہے، ابتدائی تعلیم بھی اور اعلیٰ تعلیم بھی۔ اب سعودی عرب کے بعض دانشور وہاں یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ ابتدائی درجہ (المرحلة الابتدائية) میں شروع کے تین سال کی تعلیم عورتوں کے حوالہ کر دی جائے۔ اور اس کی دلیل عین وہی دی جاتی ہے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں ہوا۔ یعنی مادرانہ شفقت۔ وہ کہتے ہیں:

ان الطفل محتاج الى الاحساس بالامن والحب والحنان۔ وهو ما لا يتحقق الا على يد المعلمات بكل ما يحملن من غرائز الامومة الحانية (صفحہ ۲۰)

احمد محمد جمال صاحب نے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف نہایت شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے جس کا اندازہ ان کے عنوان سے ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے لیے خاتون معلم مقرر کرنے کو "فتنہ" قرار دیتے ہیں، ایک ایسا فتنہ جس کے بیدار کرنے پر آدمی خدا کی لعنت کا مستحق قرار پائے۔ انھوں نے اس نظریہ کو نہ صرف اسلامی اعتبار سے مکمل طور پر رد کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے خاتون معلم کے مقابلہ میں مرد معلم زیادہ بہتر ہے:

واعتقد الرجل اصلح من المرأة فى التدريس خلال المرحلة الابتدائية

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مختلف اسلام پسند ایک دشمن کے خلاف متحد ہوتے ہیں۔ اور جب خارجی دشمن ہٹ جاتا ہے تو خود ایک دوسرے کے دشمن بن کر آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

سرکشی

ایک صاحب کو اپنے ایک مسلمان بھائی سے شکایت ہوگئی۔ اس کے بعد وہ انتقامی جوش سے بھر گیے۔ انھوں نے اس مسلمان کے خلاف ہر ممکن کارروائی کرنا شروع کر دیا ـــــ اس کو دھوکا دینا، اس کو بدنام کرنا، اس کے خلاف جھوٹے مقدمے چلانا، غرض کمینگی کی کوئی قسم نہ تھی جس کو انھوں نے اپنے لیے جائز نہ کر لیا ہو۔

مذکورہ بزرگ سے کہا گیا کہ آپ ایک مسلمان کے خلاف ایسی غلط کارروائیاں کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ الحرب خُدعۃ (جنگ دھوکا ہے)

اس قسم کا قول غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالنا ہے جو خدا کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں۔ کیوں کہ اَلحربُ خُدعۃٌ ان لوگوں کے لیے ہے جو ظالموں کے خلاف دفاع پر مجبور کر دیے گیے ہوں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو خدا کی زمین میں فساد برپا کریں۔ جو کسی انسان کو ناحق ستانے کا منصوبہ بنائیں جو کسی کا حق غصب کر کے بیٹھ جائیں۔ جو خود ظالم ہوں نہ کہ مظلوم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگ مختلف قسم کی سرکشی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں قرآن میں فرمایا گیا:

سنکتبُ ما قالوا (آل عمران ۱۸۱) کلّا سنکتب ما یقول (مریم ۷۹) ہرگز نہیں، ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتے ہیں۔ اور پھر قیامت کے دن ہم ان کو بتائیں گے۔

جو لوگ سرکشی کی باتیں کرتے ہیں اور جو لوگ ان کی باتوں کو دل چسپی سے سنتے ہیں وہ اسی لیے ایسا کرتے ہیں کہ ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا ہر لفظ خدائی رجسٹر میں ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ ان کو یقین نہیں کہ وہ اپنی ہر بات کے لیے آخرت کی عدالت میں جواب دہ ہوں گے۔

ایسے تمام لوگ جو حد سے تجاوز کریں اور حق کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کریں ان سے خدا کی کتاب ابدی طور پر یہ کہہ رہی ہے کہ خدا سے ڈرو، کیوں کہ خدا تمہارے ایک ایک لفظ کو لکھ رہا ہے۔

ایک سفر

پٹنہ ریاست بہار کی راجدھانی ہے۔ اس کا قدیم نام پاٹلی پتر تھا۔ مگدھ کے راجہ نے پانچویں صدی قبل مسیح میں پاٹلی پتر کی بنیاد رکھی۔ مگدھ کے بعد نندا اور موریہ اور سونگا نے یہاں راج کیا۔ چندر گپت موریہ (۲۹۷ - ۳۲۱ ق م) کے زمانہ میں ایک یونانی سفیر میگاس تھینز (Megasthenes) یہاں آیا اور کئی سال مقیم رہا۔ اس نے اپنی یادداشت میں یہاں کے راجہ کے حالات لکھے ہیں۔ چندر گپت موریہ حضرت مسیح سے پہلے پیدا ہوا، اور اس کا تذکرہ اس کے معاصر مورخین کی کتابوں میں موجود ہے۔ مگر حضرت مسیح کا تذکرہ ان کے معاصر مورخین کی کتابوں میں موجود نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جن شخصیتوں کو آج لوگ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے عظمت و تقدس کا اعلیٰ ترین درجہ دیئے ہوئے ہیں ان کے ہم زمانہ لوگوں کی نظر میں وہ سرے سے کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھے۔

افغان حکمراں شیر شاہ نے اس علاقہ کو ۱۵۴۱ میں فتح کیا اور اس کا نام پٹنہ رکھا۔ شیر شاہ کی حکومت صرف پانچ سال تک باقی رہی۔ اس کے بعد پٹنہ اورنگ زیب (۱۶۵۹ - ۱۷۰۷) کے ماتحت آیا اور اس نے اپنے پوتے شہزادہ عظیم کے نام پر اس کا نام عظیم آباد رکھا۔ انگریزی دور میں دوبارہ وہ پٹنہ بن گیا۔ یہ ۱۸۶۵ کا واقعہ ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۱۷ میں قائم ہوئی۔ یہاں کی قدیم عمارتوں میں سے ایک بنگال کے ہمایوں شاہ کی مسجد بھی ہے جو ۱۴۹۹ میں تعمیر ہوئی تھی۔

ایک پروگرام کے تحت ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ کی صبح کو میں پٹنہ پہونچا۔ اور ۱۳ جولائی کی شام کو پٹنہ سے دہلی واپس آیا۔

۱۲ جولائی کی صبح کو ۱۰ بجے پٹنہ کے تعلیم یافتہ افراد کی ایک نشست ہوئی۔ اس نشست کا انتظام پٹنہ ہائی کورٹ کے سینیر جج آنریبل مسٹر جسٹس ایس کے جھا نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر کیا تھا۔ اس میں ہندو مسلم دونوں طبقہ کے لوگ شریک تھے۔

جسٹس جھا نے اپنی تمہیدی گفتگو میں کہا کہ "مولانا صاحب اسٹانچ مسلم ہیں اور میں

اسٹائچ ہندو ہوں۔ اس لیے میرے اور ان کے درمیان موافقت ہونا بہت مشکل ہے۔" اس کے بعد میں نے تقریر کی اور تقریباً پون گھنٹہ تک اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں جسٹس جھا دوبارہ بولے۔ انھوں نے کہا کہ اب میں اپنی پہلی والی بات کو واپس لیتا ہوں۔ مولانا صاحب نے جو بات کہی وہ بہت اچھی اور گہری بات ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے مجھے ایک ہفتہ لگے گا۔

حاضرین میں سے ایک معمر آدمی نے کہا کہ میری عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنی پوری عمر میں کبھی میں نے ایسی باتیں نہیں سنیں جو آج میں نے مولانا صاحب کی زبان سے سنی ہیں۔ ہائی کورٹ کے ایک ہندو جسٹس نے کہا کہ یہ بڑی عجیب تقریر تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ مذہب کا یہ مطلب بھی ہے۔

پٹنہ میں میرا قیام مسٹر ایم ٹی خان کے مکان (عدالت گنج) پر تھا۔ یہاں لوگ برابر آتے رہے اور ان سے مختلف اسلامی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ ان آنے والوں میں مسلم بھی تھے اور ہندو صاحبان بھی۔

۱۲ جولائی کی شام کو نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس کا مقام خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کا ہال تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں آئے۔ ہال اس طرح بھرا ہوا تھا کہ لوگوں کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ چنانچہ بعد کو آنے والے گیلری میں کھڑے ہو کر سنتے رہے تقریر کا موضوع "اسلام اور عصر حاضر" تھا۔ سخت گرمی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ مگر ایک ایک شخص آخر تک دم بخود ہو کر سنتا رہا۔

آخر میں سوالات کا اعلان کیا گیا۔ تاہم بیشتر لوگ اپنے تاثر کے تحت چپ رہے۔ البتہ چند افراد نے سوالات کیے۔ میں نے سوالات کی وضاحت کی۔ مگر یہ سوالات زیادہ تر اصل موضوع سے غیر متعلق تھے۔ ایک صاحب جن کا تعارف "پروفیسر" کے لفظ سے کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ الشمس تجری لمستقر لہا۔ یعنی سورج چل رہا ہے جب کہ علم الافلاک کہتا ہے کہ سورج اسٹیشنری (غیر متحرک) ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ جدید فلکیات واضح طور پر سورج کو متحرک بتاتی ہے۔ بلکہ جدید سائنس کے نزدیک

دنیا کی ہر چیز متحرک ہے۔ وہ خاموش ہوگیے۔

اجتماع کے بعد کچھ نوجوانوں نے آٹوگراف لیا۔ میں نے ایک صاحب کی بک پر یہ جملہ لکھ دیا:

جو بولا وہ نہیں بولا، جو چپ رہا وہی بولا

پٹنہ کے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ پٹنہ روایتی طور پر اہل علم کا شہر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "اہل علم کا نہیں بلکہ اہل شعر کا"۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں بہت سے شعرا پیدا ہوئے۔ اور یہاں مشاعرے ہوتے ہیں تو ان میں سامعین کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سائنس کا دور ہے اور سائنس کے دور میں شاعری کرنا ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (Anachronism) ہے۔ چنے کی دال پر قُل ہو اللہ لکھنا ایک آرٹ ہو سکتا ہے مگر اس کا عملی فائدہ کیا ہے۔ اسی طرح ردیف وقافیہ کی زبان میں باتیں کہنے سے کچھ لوگ وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں مگر کیا اس طرح کی شاعری سے یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم دور جدید میں اپنی کھوئی ہوئی جگہ پالے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک میں ہمارے ساتھ تعصب کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سب سے بڑا فریب ہے جس میں اس ملک کے مسلمان مبتلا ہیں اور ہمارے تمام اصاغر و اکابر مسلسل یہی ذہن مسلمانوں میں پیدا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ "تعصب" کہتے ہیں وہ دراصل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ فرض کیجئے کہ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا عرب میں جاکر دس ہزار روپیہ مہینہ کما رہا ہے، دوسرا بیٹا گھر پر پڑا ہوا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ کیا دونوں بیٹوں کا مقام گھر کے اندر یکساں ہوگا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ گھر میں بے کار پڑا رہنے والا بیٹا اگر کہے کہ میرے ساتھ تعصب کیا جاتا ہے۔ تو کیا آپ اس کو مانیں گے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ یہی معاملہ اس ملک میں مسلمانوں کا ہے۔ آپ کا بے کار بیٹا اپنے نکمے پن کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح اس ملک کے مسلمان بھی اپنی بے شعوری اور اپنے پچھڑے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں، اس کا کوئی

تعلق تعصب یا فرقہ واریت سے نہیں۔

مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے شاعروں اور خطیبوں نے انھیں جھوٹے فخر میں مبتلا کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر ہو کر رہ گیے۔ آپ مسلمانوں کو حقیقت پسند بنا دیجئے اور اس کے بعد اس ملک میں ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

ایم ٹی خان سے کسی صاحب نے کہا کہ الرسالہ والے تو صرف مرض کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ اس کا حل نہیں بتاتے۔ اس سے کیا فائدہ۔ ایم ٹی خان نے کہا کہ آپ سمجھے نہیں ایک شخص کی صحت خراب ہے۔ وہ ڈاکٹر سے ملتا ہے، ڈاکٹر اس کا جائزہ لے کر کہتا ہے کہ تم اینمک ہو۔ یہ صرف مرض بتانا نہیں ہے، یہ علاج بھی ہے۔ کسی شخص سے یہ کہنا کہ تم اینمک ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر ہیموگلوبن کم ہے۔ اس لیے وہ چیزیں استعمال کرو جس سے ہیموگلوبن کی پیداوار بڑھتی ہے۔ مریض اگر اتنا باشعور نہیں ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے کہا کہ ہر کام میں شروع شروع میں مشکل پیش آتی ہے۔ مگر یہ ایک قسم کا دانت نکلنے کا درد (Teething trouble) ہے۔ دانت نکلنے کے وقت ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے مگر یہ تکلیف وقتی ہوتی ہے۔ آپ اس کو برداشت کر لیں تو وقت گزرنے کے بعد وہ اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ باتیں تو بہت اچھی کہتے ہیں مگر کوئی عملی پروگرام پیش نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں "عملی پروگرام" پیش کرنا قوم کے ساتھ غداری کرنا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی قوم کو بیوقوف بنا کر اس کے اوپر لیڈری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں خدا کے فضل سے ایسا کر سکتا ہوں کہ ایک خوش نما پروگرام بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دوں۔ لیکن موجودہ حالت میں میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے یہ پسند ہے کہ میں قبر میں دفن ہو جاؤں۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ ایک ایسی قوم کے سامنے "عملی پروگرام" پیش کروں جس کے پاس بے شعوری کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔

میں نے کہا کہ عملی پروگرام اس وقت پیش کیا جاتا ہے جب کہ نظری پروگرام قابل لحاظ

حد تک کامیابی کے درجہ کو پہونچ چکا ہو۔ جب قوم فکر و شعور کے اعتبار سے ضروری حد تک تیار ہو چکی ہوتی ہے، اسی وقت اس کو عملی پروگرام دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے سارا زور صرف تعمیر شعور پر صرف کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ الرسالہ کی اشاعت بڑھائی جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ تعمیر شعور کی مہم ہے اور یہی اس وقت ہمارا سب سے بڑا پروگرام ہے۔

میں ایک صاحب کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کی سڑک پر ایک گائے والا گائے لے کر نکلا۔ میں نے کہا کہ اس گائے کو دیکھیے۔ یہ خدا کا ایک زندہ کارخانہ ہے۔ خدا نے اس کو دودھ دینے کے لیے بنایا ہے۔ مگر وہ دودھ کیسے دیتی ہے۔ وہ گھاس کو دودھ میں کنورٹ (تبدیل) کرتی ہے، تبھی وہ دودھ دینے والی بنتی ہے۔ خدا کو ایسی گائے مطلوب نہیں ہے جو دودھ پی کر دودھ دے۔ بلکہ اس کو ایسی گائے مطلوب ہے جو غیر دودھ کھائے اور پھر اس کو تبدیل کر کے دودھ کی شکل میں باہر لائے۔

میں نے کہا کہ گائے کی یہ ساخت خود خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس طرح "گائے" گویا خدا کی پسند کا ایک مظاہرہ ہے۔ وہ عمل کی زبان میں انسانوں سے کہہ رہی ہے کہ تم بھی ایسے ہی بنو۔ تمہارے کان میں برے الفاظ داخل ہوں مگر وہ تمہاری زبان سے اچھے الفاظ بن کر نکلیں۔ لوگ تمہیں ستائیں مگر تمہارے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں۔ لوگ تمہارے ساتھ برا سلوک کریں مگر تم سے انھیں اچھے سلوک کا تجربہ ہو۔

پھر اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی تعمیر کے معاملہ میں مسلمانوں کا طریقہ کیا ہونا چاہیے انھیں خدا کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے یہ ثبوت دینا ہوگا کہ وہ "گھاس" کو "دودھ" میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ مشکل کو اپنے لیے آسان بنا سکتے ہیں۔ وہ کم تر ذرائع سے ایک برتر دنیا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو تزکیہ (یا اسلامی تربیت) کہا جاتا ہے۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ چنانچہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ

ایک چڑیا بھی فضا میں پر نہیں پھڑپھڑاتی تھی کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کرتے تھے (مامن طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکر لنا منہ علماً)

بعد کے زمانہ میں "سلوک" کے نام سے جو مشقی کورس بنائے گیے وہ سراسر بدعت تھے۔ اس قسم کے مشقی کورسوں سے کبھی وہ افراد تیار نہیں ہو سکتے جو اسلام میں مطلوب ہیں۔

مسلمانوں کا ایک عجیب مزاج یہ ہے کہ جب حقیقت ان سے کھوئی گئی ہو تو وہ الفاظ کے گلدستے بنا لیتے ہیں اور ان کو بول کر خوش رہتے ہیں۔ پٹنہ کے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے بطور خود پٹنہ کا ایک اور نام اختیار کر رکھا ہے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہے۔ یہ نام ہے ——— عظیم آباد۔ مسلمان اکثر پٹنہ کو پر فخر طور پر عظیم آباد کہتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کے مسلمان دہلی کو شاہ جہاں آباد اور کشمیر کے مسلمان اننت ناگ کو اسلام آباد کا نام دیئے ہوئے ہیں۔ یہ خوش قسمتی کی عجیب وغریب قسم ہے جو مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔ جو چیز انھیں عملی طور پر حاصل نہ ہو، اس کو وہ ایک دل پسند لفظ بول کر خیالی طور پر حاصل کر لیتے ہیں۔

پٹنہ بہار کی راجدھانی ہے۔ مگر سڑکوں پر جگہ جگہ گندگی اس طرح نظر آئی جیسے یہاں کے منتظمین کو صفائی کا کوئی شعور ہی نہیں۔ مگر جب میں "وی آئی پی ایریا" سے گزرا تو میری غلط فہمی ختم ہو گئی۔ وزیروں اور بڑے بڑے عہدیداروں کے رہائشی علاقہ میں صفائی ستھرائی کا پورا اہتمام نظر آیا۔ گویا یہاں کے منتظمین کے اندر صفائی کا شعور ہے مگر وہ صرف اپنے لیے ہے نہ کہ شہر کے لیے ——— آج ملک کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ یہاں ذاتی غرض کو برتر حیثیت حاصل ہے نہ کہ اصول کو۔

یہاں آٹھ ماہ پہلے مسلمانوں کا ایک جلوس نکلا تھا۔ اس میں فائرنگ ہوئی اور کئی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ انھیں میں ایک مسلم نوجوان تھے جن کے پاؤں میں گولی لگی اور وہ پچھلے آٹھ مہینے سے اسپتال میں ہیں۔ اور ابھی غالباً مزید آٹھ ماہ تک انھیں اسپتال میں رہنا ہوگا۔ ان کو دیکھنے کے لیے میں اسپتال گیا۔ ان کے پاؤں میں پلاسٹر بندھا ہوا

تھا اور وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل سے دعائیں نکلیں۔ آخر میں میں نے انھیں ایک جملہ لکھ کر دیا جو یہ تھا :

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مقصد اعلیٰ سے
کم تر کسی چیز میں استعمال کیا جائے۔

۱۳ جولائی کو دن میں ۱۱ بجے مدرسہ شمس الہدیٰ (قائم شدہ ۱۹۱۲) کے ہال میں اجتماع ہوا۔ یہاں بھی ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تقریر کا موضوع تھا : دور جدید میں مسلمانوں کا پچھڑا پن اور اس کا حل۔ لوگ انتہائی انہماک کے ساتھ آخر تک تقریر سنتے رہے۔ شہر کے معززین کی بھی بڑی تعداد ڈائس پر موجود تھی۔

تقریر کے بعد مختلف لوگوں کے تاثرات معلوم ہوئے۔ لوگ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور تقاضا کیا کہ مزید قیام کریں یا دوبارہ پٹنہ کا پروگرام بنائیں۔

پچھلے ایک سال کے اندر مجھے ہندستان کے کئی شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان سفروں میں جو اجتماعات ہوئے اور جتنی کثرت سے لوگ "الرسالہ کی آواز" سننے کے لیے جمع ہوئے، اس کے بعد میری قطعی رائے یہ ہو چکی ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا ذہین طبقہ اب سب سے زیادہ الرسالہ کی تحریک کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ہر شہر میں ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد جس کثرت سے جمع ہوئی اس کے بارہ میں عام تاثر یہ تھا کہ کسی بھی دوسری آواز کو سننے کے لیے تعلیم یافتہ طبقہ اتنی بڑی تعداد میں جمع نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ایک جذباتی اشو اٹھا کر عوام کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے۔ مگر سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ جتنی بڑی تعداد میں الرسالہ کی آواز سننے کے لیے جمع ہو رہا ہے ملک میں کوئی بھی دوسری آواز نہیں ہے جو سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اتنی بڑی تعداد میں جمع کر سکے۔

دہلی اور پٹنہ کے درمیان تقریباً ایک ہزار کیلو میٹر کی دوری ہے۔ ہوائی جہاز سے یہ دوری صرف ڈیڑھ گھنٹہ میں پوری ہو جاتی ہے۔ میں ۱۲ جولائی کی صبح کو دہلی سے پٹنہ گیا اور وہاں کئی پروگرام میں شرکت کر کے ۱۳ جولائی کی شام کو دوبارہ دہلی

واپس آگیا۔ جب میں دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا تو میرا دل خدا کے احسان کے جذبہ سے سرشار تھا۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کیسی عجیب نعمت ہے کہ اس نے دور دراز سفروں کو اتنا آسان بنا دیا ہے۔

۱۵۷۳ء میں شہنشاہ اکبر فتح پور سے گجرات گیا تھا۔ یہ سفر ایک جنگی مہم کے تحت تھا اور اس کے لیے شاہانہ سطح پر غیر معمولی انتظامات کیے گیے تھے۔ تب بھی شہنشاہ اکبر کو اس سفر کے طے کرنے میں گیارہ دن لگ گیے۔ وہ روزانہ پچاس میل کا سفر طے کرتا تھا۔ قدیم مورخین اس تیز رفتار سفر کا ذکر نہایت حیرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ چار سو سال بعد وہ وقت آنے والا ہے کہ اس سے زیادہ لمبے سفر اس سے زیادہ کم وقت میں انجام دیئے جاسکیں گے۔

واپسی میں ہوائی جہاز معمول کے مطابق اڑ رہا تھا کہ اچانک اعلان ہوا :

Please fasten your seat belt.

(آپ اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں)۔ چند منٹ بعد جہاز تیزی سے نیچے اوپر ہونے لگا۔ معلوم ہوا کہ اپ ڈرافٹ ، ڈاون ڈرافٹ (Updraft and downdraft) کا علاقہ آگیا ہے۔ ہوائی جہاز کے تربیت یافتہ عملہ کے لیے اس قسم کا تجربہ زیادہ پریشان کن نہیں ہوتا۔ مگر ایک عام مسافر کے لیے یہ صورت حال سخت گھبرا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ شاید اب ہوائی جہاز زمین پر گر کر تباہ ہونے والا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے تمام مسافر بھی۔

میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں نیچے اوپر (اپ ڈرافٹ، ڈاؤن ڈرافٹ) کی کیفیت ہو تو لوگ ڈر جاتے ہیں کہ شاید ان کا آخری وقت آگیا۔ لیکن غور کیجیے تو آدمی کا اپنا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہر لمحہ آدمی کی ایک سانس اندر جاتی ہے اور ایک سانس باہر آتی ہے۔ جب آدمی کی ایک سانس اندر جاتی ہے تو یہ یقینی نہیں ہوتا کہ وہ پھر باہر آئے گی۔ اسی طرح جب اس کی ایک سانس باہر آتی ہے تو یہ یقینی نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اندر جائے گی۔ ایسی حالت میں آدمی ہر آن اسی صورت حال سے دوچار ہے جس سے ہوائی جہاز

کا مسافر کبھی کبھی دوچار ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا شعور زندہ ہو تو ہر لمحہ اس کو محسوس ہوگا کہ وہ اپ ڈرافٹ، ڈاؤن ڈرافٹ کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو ہوائی جہاز کے نیچے اوپر ہونے کے واقعہ میں خود اپنے نیچے اوپر ہونے کے واقعہ کو دیکھ لیں۔

اس سفر میں بہت سے لوگوں کے سوالات سامنے آئے اور حسب موقع میں نے ان کا جواب دیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی اور الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ نہ دیکھئے کہ لوگ مخالفت کرتے ہیں، بلکہ یہ دیکھئے کہ جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت کی بنیاد کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام پیغمبر بلاشبہ حق پر تھے۔ اس کے باوجود ان پیغمبروں کی سب سے زیادہ مخالفت کی گئی۔ حتی کہ ان پر ریکیک قسم کے اخلاقی الزام لگائے گیے۔ اس کی تفصیل آج بھی پچھلے انبیاء کے بارے میں بائبل میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مخالفت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے بیّنہ (واضح دلیل) کی بنیاد پر کسی کی مخالفت کرنا۔ اور دوسری چیز ہے کسی کے خلاف عیب جوئی اور الزام تراشی کرنا۔ مثلاً پیغمبر کی دعوت توحید کی دعوت تھی۔ اب پیغمبر کو بینہ کی بنیاد پر رد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص توحید کے نظریہ کو دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کرتا۔ مگر پیغمبر کے مخالفین نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ پیغمبر کی ذات میں جھوٹے عیب نکال کر اس کو بدنام کرتے رہے۔ اول الذکر قسم کی مخالفت یا تنقید کا حق ہر شخص کو ہے۔ مگر ثانی الذکر قسم کی مخالفت یا تنقید کا حق کسی کو نہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (۴۱: ۲۶) اس آیت میں والغوا فیہ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عَیِّبُوْہ کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی اس پر عیب لگاؤ (تفسیر ابن کثیر) اس تشریح کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر نے قرآن کی دعوت کو مغلوب کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ قرآن پر اور صاحب قرآن (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر عیب لگاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیب جوئی کا طریقہ اہل کفر کا طریقہ ہے، یہ مومن کا طریقہ نہیں۔

اب آپ ہمارے مخالفین کو دیکھئے تو سب کے سب بلا استثناء وہی کام کر رہے ہیں جس کو

مذکورہ آیت میں اہل کفر کی روش بتایا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک شخص نہیں جو بیّنہ کی بنیاد پر ہماری تنقید کرے۔ یعنی وہ الرسالہ یا مطبوعات الرسالہ میں چھپے ہوئے افکار کو ہمارے اپنے الفاظ میں لے اور شرعی یا عقلی دلائل سے اس کو رد کرے۔ ہر ایک صرف یہ کر رہا ہے کہ وہ ہمارے خلاف جھوٹی کہانیاں پھیلا رہا ہے۔ وہ غیر ثابت شدہ باتوں کی بنیاد پر ہمارے خلاف الزام تراشی کی مہم چلانے میں مصروف ہے۔ یہ مخالفین بظاہر الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے کہ وہ الرسالہ کے صفحات سے ہمارے ثابت شدہ افکار کو لیں اور پھر دلائل اور براہین کی بنیاد پر ان افکار کو غلط ثابت کریں۔ اس کے برعکس وہ سنی سنائی اور بلا تحقیق باتوں کو لے کر ان کے ذریعہ ہم کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ یہ تنقید نہیں بلکہ قرآن کے مطابق یہ تعییب ہے۔ اور تعییب کی مہم چلانے والا خود اپنے آپ کو غلط ثابت کرتا ہے نہ کہ کسی دوسرے شخص کو۔

"ہمارے افکار کو ہمارے الفاظ میں لینے" کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ بعض لوگ بظاہر الرسالہ کا حوالہ دیتے ہیں مگر وہ بھی خود اپنے گھڑے ہوئے الفاظ کو ہماری طرف منسوب کرکے ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "الرسالہ مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دیتا ہے" یہ کہنے والے کے اپنے الفاظ ہیں، وہ ہمارے الفاظ نہیں۔ ان کو کہنا چاہیے کہ الرسالہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو صبر اور اعراض کا سبق دے رہا ہے، نہ یہ کہ الرسالہ بزدلی کا سبق دے رہا ہے یہ مخالفین کے اپنے جھوٹے الفاظ ہیں جو انھوں نے بطور خود گھڑ لیے ہیں، وہ ہمارے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ نہیں۔ ایسے لوگوں کو جاننا چاہیے کہ خدا نے کسی کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے گھڑے ہوئے الفاظ کو کسی کے اوپر چسپاں کرے اور اس کی بنیاد پر سمجھ لے کہ وہ شخص غلط ثابت ہو گیا۔

پٹنہ کا سفر ادارہ ترقی کامن سنس (Institute for Developing Common Sense) کی دعوت پر ہوا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک تنظیم ہے جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔

سادہ طور پر کامن سنس سے مراد وہ عام فہم باتیں ہیں جو ہر آدمی جانتا ہے اور بلا اختلاف ان کو مانتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس دنیا میں میں اکیلا نہیں ہوں، یہاں میرے سوا اور

بھی بہت سے انسان ہیں۔ یہ ایک بے حد قدیم تصور ہے۔ تاہم ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی میں وہ فلسفیانہ غور و بحث کا موضوع بن گیا۔ بعض مفکرین (مثلاً برٹرینڈرسل) نے کامن سنس کی موجودگی کا انکار کیا۔ کچھ دوسرے علماء مثلاً ٹامس ریڈ، جی ای مور نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو ایک منظم فلسفہ کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں جی ای مور کی کتاب عقلِ عام کا دفاع (Defence of Common Sense) نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۵ میں شائع ہوئی۔

تاہم پٹنہ کی مذکورہ تحریک (کامن سنس) کا تعلق اس قسم کی فلسفیانہ تحریکوں سے نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر انسانی فطرت کو جگانے اور عوام کے اندر تعمیری شعور پیدا کرنے کی تحریک ہے۔ اس تحریک کے سکریٹری مسٹر ایم ٹی خان ہیں۔ سفر سے واپسی کے بعد موصوف کا ایک مفصل خط ہمیں موصول ہوا ہے۔ اس خط کے بعض اجزا یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

U.N.I. helped us a lot. All papers gave the coverage.

Judge Saheb told that "Maulana's beauty lies in objectivity and coherent analysis. He likes comparative approach which is the tide of time."

Shamim Raza Saheb of Amin Manzil, Sabzi Bagh, Patna accomplished the long pending partition of family property after being impressed by your comments on Distributive Justice and acquisition of property. Shamim Saheb adopted tolerant attitude and sacrificial approach to end family feud.

Janab M.A. Manzoor Saheb of Chajjubagh, Patna (Retd Registrar and now advocate) derived three things while listening to your lecture at the residence of Hon'ble Mr Justice S.K. Jha of Patna High Court. (a) Indulgence in petty matters soils the fibres of approach to life. (b) Seeds of victory lie in the ashes of defeat. This mode of thinking will have no room for frustration. (c) Conditioned thinking eats into the potentialities of one's personality.

Mr Parbhat Kumar opined: Maulana's speeches were not only praiseworthy but record-worthy.

To me, *Al-Risala* paves the way for all-round over-hauling of the components of life and accompaniments of inter-human relationship.

To me, through *Al-Risala*, I invent new manures of mind and discover latent virtue of heart, every month.

S.H. Naqui Saheb says: *Al-Risala* helps one much in founding congenial atmosphere in office.

Uma Shankar and Anjani Babu (both of Patna High Court) say: *Al-Risala* is not only for Muslims but for mankind.

اخلاقی قیادت

کچھ مسلم رہنما اپنی تقریروں میں پرجوش طور پر کہتے ہیں: مسلمانوں کو آگے بڑھ کر اس ملک کی اخلاقی قیادت اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ مگر موجودہ حالت میں یہ لفظی بازیگری کے سوا اور کچھ نہیں۔

"اخلاقی قیادت" کوئی تقریری اجلاس کی صدارت نہیں جو ایک شامیانہ پھیلا کر اس کے نیچے حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک عظیم قربانی کے ذریعہ حاصل ہونے والا عظیم نتیجہ ہے۔ اخلاقی قیادت سب سے بڑا انسانی شرف ہے جو سب سے بڑی انسانیت کا ثبوت دینے کے بعد ملتا ہے۔ اخلاقی قیادت کسی کو شاعری اور خطابت کی قیمت پر نہیں ملتی۔ وہ عمل اور کردار کی اعلیٰ ترین متاع دے کر حاصل ہوتی ہے۔

اخلاقی قیادت حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یک طرفہ حسن اخلاق ہے۔ جس کو قرآن میں خلق عظیم کہا گیا ہے۔ یہ عمل کی اس نادر قسم کا ثبوت دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھالے کہ وہ تنقید کے باوجود برہم نہ ہو، وہ نفرت کرنے والوں کے ساتھ محبت کرے۔ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ انصاف کرے۔ وہ چھیننے والوں کو بھی دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ وہ اپنے دشمن کو بھی دوست کی طرح سینے سے لگا سکے۔ حقوق کی چیخ پکار کرنے والوں کو کبھی اخلاقی قیادت نہیں ملتی۔ اس دنیا میں اخلاقی قیادت صرف ان بلند انسانوں کو ملتی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے حقوق کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں پھر بھی اس کے خلاف فریاد و ماتم نہ کریں۔

اخلاقی قیادت دراصل بلند اخلاق کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب اس حد تک اوپر اٹھے کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ اس کی مسلسل قربانیوں سے جب لوگوں کے اوپر کھل جائے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ لوگ مادی سطح پر جی رہے ہیں اور وہ غیر مادی سطح پر۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فریق ثانی کے دل کو جیت سکے جس کا دوسرا نام اخلاقی قیادت ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اخلاقی قیادت صبر کی زمین پر ابھرتی ہے نہ کہ چیخ پکار کی زمین پر۔ (السجدہ ۲۴) ایک طرف احتجاج اور مطالبہ کی بات کرنا اور دوسری طرف اخلاقی قیادت کا نعرہ لگانا صرف ایک فکری تضاد ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کی دنیا میں صرف اخلاقی پستی کا مقام مقدر ہے نہ کہ اخلاقی قیادت کا۔

انسانی صفات

حضرت اسماعیل نے اپنی نسل کو ابراہیمی دین دیا تھا جو عرصہ تک غیر محرف شکل میں اور بعد کو محرف شکل میں ان کے درمیان قائم رہا۔ چند سو سال بعد پڑوسی ممالک عراق اور شام کے اثر سے بت پرستی عرب میں داخل ہوئی۔ عربوں کی آبادی بڑھی تو ان کے افراد تجارت کی غرض سے باہر جانا شروع ہوئے۔ انھیں تجارتی سفروں کے ذریعہ وہ متمدن دنیا کی بت پرستی سے واقف ہوئے۔ مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ عرب کی بت پرستی در اصل شام کی دین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا شخص جس نے عرب میں بت کو درآمد کیا وہ ایک تاجر عمرو بن لُحَیّ الخزاعی تھا۔ اپنے کسی تجارتی سفر سے واپس ہوتے ہوئے وہ ایک بت بھی اپنے ساتھ لایا اور عربوں میں اس کو رواج دینے کی کوشش کی۔ تاہم بت پرستی عرب کی زندگی کا صرف ایک جزئی حصہ تھی۔ وہ عرب زندگی میں کبھی اس طرح سرایت نہ کر سکی جس طرح وہ عراق و شام اور مصر وغیرہ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ چنانچہ وہاں کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بتوں سے بے زار تھے۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے مر گیے کہ ـــــ خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کس طرح کی جانی چاہیے تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔

ڈھائی ہزار سال کے توالد و تناسل کے ذریعہ عرب کے جغرافیہ میں جو قوم تیار ہوئی وہ انسانی اوصاف کے اعتبار سے دنیا کی بہترین قوم تھی۔ عرب کا جغرافیہ اور تہذیب و تمدن سے دوری کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ان کی فطرت پوری طرح محفوظ تھی۔ وہ تکلف کے بجائے سادگی کو پسند کرتے تھے۔ وہ انتہائی حقیقت پسند لوگ تھے۔ ان کے یہاں قول و فعل کا تضاد نہ تھا۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے۔ وہ چیزوں کو جوہر کی بنیاد پر دیکھتے تھے اور جس چیز کو حق سمجھ لیں اس کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے۔ وہ ناحق کے آگے کبھی نہیں جھکتے تھے۔ مگر جس چیز کو حق سمجھ لیں اس کو ماننے میں بھی انھیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ کسی کے اوپر جھوٹا الزام نہیں لگاتے تھے۔ ان صفات کو قدیم عرب کے لوگ المروءۃ (مردانہ پن) کہتے تھے اور یہ المروءۃ ان کے اندر کمال درجہ میں موجود تھا۔

1 یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے الرسالہ کو اس دینی عمل کا ذریعہ بنا دیا جس کو قرآن میں "تزکیہ" کہا گیا ہے۔ روزانہ خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب کان پور سے اپنے خط (۲ ستمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: "۱۹۸۵ سے الرسالہ کا مستقل خریدار ہوں۔ ۵ کاپیاں میرے یہاں آتی ہیں۔ رسالہ کیا ہے تازیانہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد ذہن فوراً آخرت کے احوال کی طرف منتقل ہو کر قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہے"۔ ایک صاحب اورنگ آباد سے اپنے خط (۲۸ ستمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: آپ کی مطبوعات نہ صرف دین کی اشاعت کا ذریعہ ہیں، بلکہ ذہنوں اور خیالات کو موڑنے کا ایک بہت ہی موثر ذریعہ ہیں۔ ہم بہت سے نوجوان آپ کی مطبوعات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ الرسالہ کا ہم لوگوں کو بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے اور اس کے آنے پر ایک ایک رسالہ کئی کئی بار پڑھا جاتا ہے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کے نتیجہ میں نوجوان طبقہ نمازوں سے جڑا ہوا ہے۔

2 انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن اپنا نفوذ بڑھاتا جا رہا ہے۔ اس کی مثالیں مختلف شکلوں میں برابر سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایران کے ایک اسکالر علی امیر بابایات لندن گئے۔ وہاں انھوں نے کسی کے یہاں انگریزی الرسالہ کا ایک شمارہ دیکھا۔ وہ ان کو پسند آگیا۔ انھوں نے لندن سے اس کا سالانہ زرتعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے تہران کے پتہ پر انگریزی الرسالہ جاری کر دیا جائے۔

3 ہندستان کے ایک بڑے شہر سے ایک صاحب لکھتے ہیں: الحمد للہ اب الرسالہ کے مشن کو لوگ سنجیدگی سے سمجھ رہے ہیں، اور آپ کی پالیسی جو عین اسلامی پالیسی ہے، اس کے قائل ہونے لگے ہیں۔ اس کی مثال ہمارے شہر میں دیکھنے کو ملی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ کو رات میں یہاں ایک میٹنگ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے یہاں کے ایک غیر مسلم ہفتہ وار اخبار نے کچھ باتیں اسلام اور قرآن کے بارہ میں

توڑ مروڑ کر لکھ دی تھیں جس پر کچھ نوجوان احتجاجی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ لوگ میٹنگ میں ایسے بھی تھے جو الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے نوجوانوں کو ایسے اقدام سے روکا۔ میں خود اس مجلس میں حاضر نہ تھا۔ وہ لوگ جو اس مجلس میں حاضر تھے وہ دوسرے دن مجھ سے ملے تو کہنے لگے کہ کل میٹنگ میں تمہاری بہت یاد آئی۔ اگر تم وہاں ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔ کیوں کہ اس میں الرسالہ کی پالیسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

4 الرسالہ کی دعوت کے سنجیدہ دعوت ہونے کا اعتراف اب عام طور پر کیا جانے لگا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک قاری اپنے خط (۱۳ اکتوبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: بمبئی کا سفرنامہ جو ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ کے الرسالہ میں چھپا ہے، اس پر بہت سے لوگوں سے گفتگو ہوئی اور بار بار ہو رہی ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات ہے۔ "کچھ علوم وہ ہیں جو درد کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں" (صفحہ ۴۲) یقیناً مولانا صاحب درد کی درسگاہ کے طالب علم ہیں، ورنہ ان کی زبان سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔

5 آج کل کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ اردو میں: تذکیر القرآن جلد دوم، خاتونِ اسلام، رازِ حیات، تعلیماتِ اسلام، تعبیر کی غلطی۔ ہندی میں: انسان اپنے آپ کو پہچان، حقیقت کی تلاش۔ انگریزی میں: مذہب اور جدید چیلنج، تبلیغی تحریک انسان اپنے آپ کو پہچان۔

6 خواتین کے حلقہ میں بھی خدا کے فضل سے الرسالہ برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ علی گڑھ سے ایک خاتون لکھتی ہیں: "میں ایک طالبہ ہوں۔ دو سال سے الرسالہ اور تذکیر القرآن غور سے پڑھتی ہوں۔ اس کے ذریعہ دل و دماغ بدلتے جا رہے ہیں۔ جب ہم کچھ خواتین صبح کو ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتی ہیں اور الرسالہ اور تذکیر القرآن کو مل کر پڑھتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے سوز دروں اور باطن کے درد نے ان کی زبان کے الفاظ میں بجلی سا اثر پیدا کر دیا ہے۔ یقین کیجئے کہ ہم الرسالہ کا انتظار اس طرح کرتے ہیں جس طرح بچے بے چینی کے ساتھ صبح عید کا انتظار کرتے ہیں۔

اسلام وہی قدیم اسلام ہے۔ مگر آپ نے اس کو زمانہ حاضر کی ضرورت کے عین مطابق پیش کیا ہے۔ آپ عصری اسلوب میں قرآنی نغمے چھیڑ کر خوابیدہ فطرت کو جگا رہے ہیں۔ (۲ر اکتوبر ۱۹۸۶)

۷۔ الرسالہ اپنے فطری اور آفاقی انداز کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول ہو رہا ہے۔ ایک انگریزی خط (۵ ستمبر ۱۹۸۶) یہاں بطور مثال نقل کیا جاتا ہے :

For the last 10 months I have been reading *Al-Risala* English and Urdu. I found very much interest in these two magazines. When I start reading, I finish it only in 30 minutes. What the topics are! May God continue to bless you in this work which is very useful for the new as well as for old generation. Your topics on Islam and all other topics in Urdu Al-Risala will help people very much in their motto. Thanking you for the edition of Al-Risala in English. I made it very popular (being a Sikh) among my friends.
J.B. Singh, H. No. 2, Allocha Bagh, Srinagar 190009

۸۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۶ کی شام کو البرٹ اسکوئر (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مفصل تقریر کی اور بتایا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا حل کیا ہے۔ تقریر کے بعد سوالات و جوابات کی مجلس ہوئی۔

۹۔ جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے، قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کی بنا پر الرسالہ اردو اور الرسالہ انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے ایک روپیہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ سے دونوں الرسالہ کی قیمت فی شمارہ چار روپیہ ہوگی۔ سالانہ زر تعاون ۴۸ روپیہ ہوگا۔ اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ پانچ پرچہ کی ایجنسی کی ماہانہ قیمت پندرہ روپیہ ہوگی۔ اور اسی نسبت سے زیادہ تعداد کے لیے۔ ڈاک خرچ میں سرکاری اضافہ کے باوجود ملکی ایجنسیوں کے لیے ڈاک خرچ بدستور ادارہ کے ذمہ ہوگا۔ غیر فروخت شدہ پرچے بھی بدستور پوری قیمت پر واپس کیے جا سکیں گے۔ کوئی صاحب ایجنسی آئندہ کسی قسم کی تبدیلی چاہتے ہوں، تو فوراً بذریعہ ڈاک مطلع فرمائیں۔ خط میں ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

نئی مطبوعات

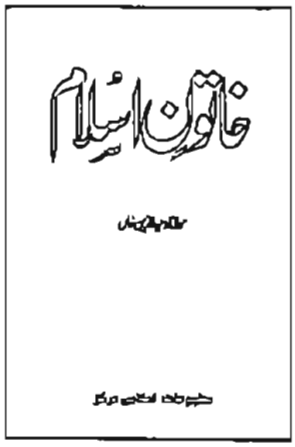

صفحات ۱۹۲ قیمت ۳۰ روپیہ

صفحات ۲۸۰ قیمت ۴۸ روپیہ

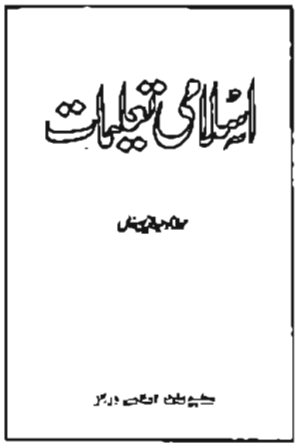

صفحات ۱۴۴ قیمت ۲۵ روپیہ

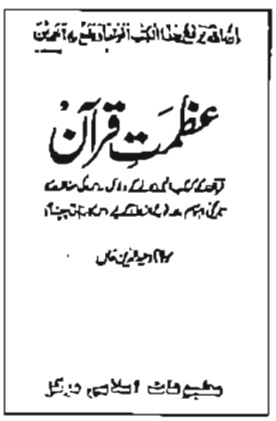

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔ وہ ایک ناقابلِ بیان ربانی نور میں نہا اُٹھتا ہے، وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل اور اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہدیہ : ۴۰ روپیہ

قرآن اپنی ذات میں اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ وہ اُسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا تھا۔ اِن خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دُنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوامِ عالم کو مُسخر کرلے گا۔

ہدیہ : ۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول بنجے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

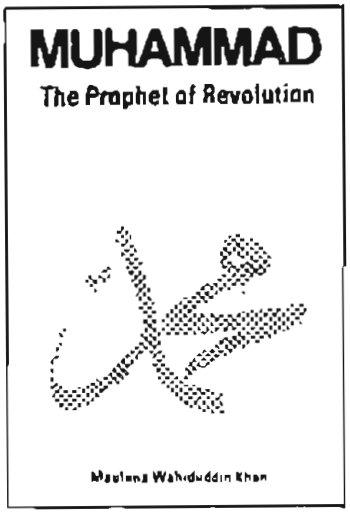

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala

C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 No. 121 December 1986

GIFTING The Word of God

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name .....

Address .....

.....

.....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Please tick box where applicable

- ☐ URDU
- ☐ ENGLISH
- ☐ ONE YEAR
- ☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES